جون
۲۰۰۶ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

اندرون

ء ۲۰۱۰

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد ۱۳۳، عدد ۶، جمادی الاول ۱۴۲۷ھ، جون ۲۰۰۶ء

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے

زر سالانہ: ۲۵۰ روپے

معاونِ خصوصی: ۳۰۰۰ روپے

بیرونی ایڈیشن: ۳۵ روپے

بنگلہ دیش، ایران، بھارت: ۷۰۰ روپے

یورپ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افریقہ: ۱۰۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا: ۱۳۰۰ روپے

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن

A/c No. 1957-3, UBL, Icchra Br. LHR

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

۶۰ سال پہلے

تفہیم القرآن سے......

اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کردیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے' اور اگر مصیبت کے بعد ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دَلِدّر پار ہو گئے' پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔[ھود ۱۱:۹-۱۰]

یہ انسان کے چھچھورے پن' سطح بینی اور قلت تدبر کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج خوش حال اور زور آور ہیں تو اکڑ رہے ہیں' فخر کر رہے ہیں' ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزاں بھی آ سکتی ہے۔ کل کسی مصیبت کے پھیر میں آ گئے تو بلبلا اُٹھے' حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے' اور بہت تلملائے تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدائی پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے۔ پھر جب بُرا وقت گزر گیا اور بھلے دن آئے تو وہی اکڑ' وہی ڈینگیں اور نعمت کے نشے میں وہی سرمستیاں پھر شروع ہو گئیں۔

انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض ایک نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبر تمھیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب آئے گا' اور تم اس کی یہ بات سن کر ایک زور کا ٹھٹھا مارتے ہو اور کہتے ہو کہ ''دیوانے دیکھتا نہیں کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے' ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریرے اُڑ رہے ہیں' اس وقت تجھے دن دھاڑے یہ ڈراؤنا خواب کیسے نظر آ گیا کہ کوئی عذاب ہم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے''، تو دراصل پیغمبر کی نصیحت کے جواب میں تمھارا یہ ٹھٹھا اسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل تر مظاہرہ ہے' خدا تو تمھاری گمراہیوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمھاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ' مگر تم اس مہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کہ ہماری خوش حالی کیسی پایدار بنیادوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چمن کیسا سدا بہار ہے کہ اس پر خزاں آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ (تفہیم القرآن' سورۂ ہود' ترجمان القرآن' جلد ۲۹' عدد ۱' رجب ۱۳۶۵ھ' جون ۱۹۴۶ء' ص ۱۸-۱۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان کی معاشی ترقی اور خوش حالی

دعوے اور حقیقت

پروفیسر خورشید احمد

کسی بھی حکومت کی کارکردگی اور اس کی کامیابی اور ناکامی کو جانچنے کے لیے پوری دنیا میں چار سے پانچ سال کی مدت کافی سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے پارلیمنٹ کی مدت بالعموم زیادہ سے زیادہ پانچ سال رکھی جاتی ہے اور جہاں کسی بھی نوعیت کا صدارتی نظام ہے‘ وہاں بھی عام طور پر صدر کی ایک مدت کے لیے چار یا پانچ سال مقرر کیے جاتے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو فوجی انقلاب کے ذریعے برسرِاقتدار آئے اور ان کی معاشی ٹیم اپنی حکمرانی کے سات سال پورے کرنے کو ہے۔ اس پورے زمانے میں جنرل مشرف چیف ایگزیکٹو کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور شوکت عزیز صاحب ان کی معاشی ٹیم کے کرتادھرتا کی حیثیت سے کارفرما رہے ہیں۔ جنرل صاحب ایک عرصے سے اپنے اور اپنی ٹیم کے معاشی کارناموں کو اپنی سب سے بڑی کامیابی کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ امریکا‘ برطانیہ اور بھارت تینوں کے ٹی وی چینلوں کو انٹرویو دیتے ہوئے اس چبھتے ہوئے سوال کا کہ: آپ کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟ جواب دیتے ہوئے‘ انھوں نے بڑے فخر سے فرمایا: معاشی ترقی اور خوش حالی کا حصول۔ جناب شوکت عزیز صاحب نے اس دعوے میں مزید رنگ بھرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ملک میں فی کس آمدنی اب ۸۰۰ ڈالر سالانہ ہوگئی ہے۔ غربت میں ۷ فی صد کی کمی واقع ہوئی۔

بے روزگاری میں بھی کمی ہوئی ہے اور وہ اب ۷ء۷ فی صد سے کم ہوکر ۶ء۵ فی صد پر آ گئی ہے۔ آخری لیبر سروے کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کے مطابق' ان کا ارشاد ہے کہ ۰۴-۲۰۰۳ء میں بے روزگاروں کی تعداد ۳۵ لاکھ تھی جو ۰۵-۲۰۰۴ء میں کم ہوکر ۳۳ لاکھ ۳۰ ہزار رہ گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حقیقت میں شرح نمو ۶ اور ۸ فی صد کے درمیان ہے اور پرائمری تعلیم میں اس درجہ اضافہ ہوا ہے کہ پرائمری تعلیم کے لائق بچوں کا ۸۶ فی صد اب تعلیمی اداروں میں داخل ہو رہا ہے اور بچوں کی آبادی کا ۸۳ فی صد صحت کی ابتدائی سہولت یعنی immunization سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ۲۰۰۷ء تک تمام دیہاتوں تک بجلی کی روشنی پہنچ جائے گی اور ملک کی پوری آبادی کو صاف پانی دستیاب ہونے لگے گا۔

جنرل صاحب کی معاشی ٹیم ان خوش نما دعووں کا اس کثرت سے اعلان کر رہی ہے کہ ہٹلر کے دروغ گوئی کے مشہور وزیر گوبلز کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان دعووں کا بے لاگ علمی جائزہ لیا جائے اور صحیح معاشی صورت حال بے کم و کاست قوم کے سامنے رکھی جائے۔ چونکہ جون کے مہینے میں نیا بجٹ بھی آنے والا ہے' اس لیے اس جائزے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی موزوں وقت نہیں ہوسکتا۔

ہم معاشی حالات کے جائزے سے قبل اس بات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کے نمایندوں کے ان دعووں پر ہم ہی انگشت بدنداں نہیں' ملک کے اکثر ماہرین معاشیات حیران و ششدر ہیں اور ورلڈ بنک' ایشین ڈویلپمنٹ بنک' اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) اور امریکا کے مشہور رسالے فارن پالیسی کی تجزیاتی ٹیم سب ہی نے ان دعووں کے برعکس اعلان کیا ہے کہ زمینی حقائق کچھ اور ہیں۔ اور ملک کا ہر شہری اپنے روزمرہ کے تجربے کی بنیاد پر ان حقائق پر گواہی دے رہا ہے کہ اعداد و شمار کا یہ کھیل حقیقت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ مرکزی حکومت کے ایک سابق سیکرٹری ڈاکٹر جیلانی نے دی نیوز میں اپنے ایک مضمون میں بڑے دل چسپ انداز میں لکھا ہے کہ میں ہی نہیں میرا ڈرائیور' باورچی اور خاکروب تک بازار سے جو چیز بھی لینے جاتا ہے' اس کا تجربہ سرکاری اعلانات کی ضد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد جاوید برکی جو ڈان میں معاشی امور پر ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں' ورلڈ بنک میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے ہیں اور ایک عبوری حکومت میں

وزیرخزانہ کی ذمہ داری بھی ادا کر چکے ہیں' حکومت کو متنبہ کرتے ہیں کہ:

> حکومت کوئی قدم اٹھا سکتی ہے بشرطیکہ وہ دو باتیں پہلے کرے۔ سب سے پہلے اسے یہ خیال جھٹک دینا چاہیے کہ معیشت میں سب اچھا ہے۔ (ڈان، ۱۸ اپریل ۲۰۰۶ء)

ملک کے توازن ادایگی (balance of payments) میں شدید خسارے کے رجحان' اسٹاک ایکسچینج ہی میں نہیں پوری معیشت میں سٹہ اور سٹے کی بنیاد پر تجارتی سرگرمی اور بنکوں کے نظام کی کمزوری کی روشنی میں موصوف نے اس طرح کے خطرے تک کے امکان کا اظہار کیا ہے جیسا میکسیکو میں چند سال پہلے رونما ہوا تھا۔

> جب میں ان باتوں کی طرف دیکھتا ہوں جو میکسو کے بحران سے پہلے پیش آئیں' تو میں انھیں آج کے پاکستان میں موجود پاتا ہوں۔ (ڈیلی ٹائمز، ۲۶ اپریل ۲۰۰۶ء)

ایک اور آزاد ماہر معاشیات ڈاکٹر ایس اکبر زیدی اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

> گو کہ نمو (growth) کے اور اسٹاک مارکیٹ کے اعداد وشمار پروپیگنڈے کے لیے اچھے نظر آتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ حقیقی معیشت پر ان کا اچھا اثر ہو' جیسا کہ چند برس پہلے بھارت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ غربت اور بے روزگاری میں کمی آئی ہے' اگرچہ اسے ابھی یہ انکشاف کرنا ہے کہ یہ اعداد وشمار اسے کہاں سے ملے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ پاکستان میں عدمِ مساوات میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ہر کسی کو نظر آتا ہے اور پاکستان کے شہری منظرنامے سے ظاہر ہے۔ کچھ ہی صارف تسلیم کریں گے کہ افراطِ زر اتنا کم ہے' زیادہ تر لوگ یقین رکھتے ہیں کہ معیشت میں 'بہتری' کے باوجود ان کی زندگی کا معیار گرا ہے۔ (روزنامہ ڈان، ۷ اپریل ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر اکمل حسین ٹی ایس ایلیٹ کے مشہور مصرعے: between ideas and reality fall the shadows (تصورات اور حقیقت کے درمیان سائے ہوتے ہیں) کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

> حکومت کی معاشی کارکردگی کے تصور اور عوام کو جن معاشی حقائق کا سامنا ہے' ان کے درمیان خلیج بڑھ رہی ہے' جب کہ حکومت زیادہ نمو کے کارنامے کی خوشی منا رہی ہے۔

عوام کی اکثریت بنیادی ضروریات اور افراطِ زر سے حقیقی آمدنی میں کمی کے مسلسل استحصال کا شکار ہے۔ حکومت بتاتی ہے کہ بڑے پیمانے کے صنعتی سیکٹر میں ۱۹ فی صد سے زائد اضافہ ہوا ہے، لیکن اس میں پُرتعیش گاڑیوں کا حصہ امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے تفاوت پر بے چینی کا مظہر ہے۔ (ڈیلی ٹائمز، یکم مئی ۲۰۰۶ء)

حکومت کے دعووں، عام آدمی کے شدید محرومی کے تجربات اور آزاد معاشی ماہرین کے سرکاری دعووں کے بارے میں واضح تحفظات کے اظہار نے بے یقینی کی جو فضا سی پیدا کر دی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ حقیقت کو جاننے کی معروضی کوشش کی جائے اور یہ جائزہ علمی بنیادوں پر اور اعداد و شمار کی صحیح تعبیر کے ساتھ لیا جائے۔ ان صفحات میں اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۱- پہلی بات جو ہم سب کے لیے تشویش کا باعث ہے وہ سرکاری اعداد و شمار کے قابلِ اعتماد ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ آزادی کے ۵۸ سال کے بعد بھی ہم اعداد و شمار جمع کرنے کے آزاد اور قابلِ اعتماد ادارے سے محروم ہیں۔ بلکہ اس وقت تو عالم یہ ہے کہ دو سال سے سرکاری شعبہ شماریات سیکرٹری اور شماریات کے علم میں تخصص رکھنے والے ماہرین کے بغیر چلایا جا رہا ہے۔ اس ادارے کو جوائنٹ سیکرٹری اور ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے کے افراد چلا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ اہم ادارہ اعلیٰ فنی ماہرین کی رہنمائی سے بھی محروم ہے۔ بار بار آزاد شماریاتی مقتدرہ (statiscal authority) کے قیام کے وعدے کیے گئے ہیں لیکن اس مرکزی اہمیت کے ادارے کو مناسب بنیادوں پر قائم کرنے کے کام سے مجرمانہ تغافل برتا جا رہا ہے۔ ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک اور پارلیمنٹ کی کمیٹیاں برسوں سے فریاد کناں ہیں مگر کوئی پیش رفت نہیں ہوتی جو اس شبہے کو تقویت دیتی ہے کہ یہ سب کچھ اعداد و شمار کو حسبِ خواہش مرتب کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ آئی ایم ایف بار بار متنبہ کر چکا ہے کہ پاکستان کی وزارتِ خزانہ ہمیں غلط اعداد و شمار دیتی رہی ہے اور یہ بات پوری قوم کے لیے شرمندگی کا باعث رہی۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اسٹیٹ بنک کی رپورٹ میں ایک جگہ نہیں نصف درجن سے زیادہ مقامات پر کہا گیا ہے کہ یا ہمیں تازہ ترین اعداد و شمار نہیں دیے جا رہے یا ہمارے اعداد و شمار اور محکمہ شماریات کے اعداد و شمار میں مطابقت نہیں۔ فنی اعتبار سے لاپروائی کا یہ حال ہے کہ صارف کے

لیے قیمتوں کا اشاریہ، جو ہر اعتبار سے ایک بنیادی اہمیت کا حامل اشاریہ ہے، اس کے مرتب کرنے کے لیے جن مقامات اور جن منڈیوں (markets) کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں دیہی آبادی کا ایک بھی مرکز شامل نہیں۔ صرف شہری آبادی کے ۳۵ مراکز اور ۷۱ مارکیٹوں سے ساری معلومات جمع کی جاتی رہی ہیں اور بار بار کی گرفت کے باوجود اس کی اصلاح نہیں کی گئی۔ اب وعدہ کیا جا رہا ہے کہ ۲۰۰۷ء میں شہری اور دیہی دونوں آبادیوں سے معلومات حاصل کی جائیں گی اور غالباً بنیادی سال بھی تبدیل کیا جائے گا۔

برآمدات میں اضافے کی بات بڑے کروفر سے کی جارہی ہے کہ اس سال کُل برآمدات ۱۷ یا ۱۸ بلین ڈالر تک پہنچ جائیں گی مگر چمڑے اور چمڑے کی مصنوعات کی برآمد کے بارے میں جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں، اس پر چمڑے کے صنعت کاروں اور برآمد کنندگان کی ایسوسی ایشن کا جو سرکاری ردعمل آیا ہے وہ چشم کشا ہے۔ شماریات کے فیڈرل بیورو کے سرکاری اعداد و شمار کی رو سے اس سال میں چمڑے کی مصنوعات کی برآمدات میں ۵۷ فی صد اضافہ ہوا ہے، جب کہ متعلقہ صنعت کے ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ اس اضافے میں بڑا دخل جھوٹے بلوں (fake invoicing) کا ہے جو صرف رعایت (rebate) لینے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایسوسی ایشن کے نمایندوں کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے سال کے ۲۴۴ ملین ڈالر کے مقابلے میں اس سال ۳۸۷ ملین ڈالر کی برآمدات دکھائی گئی ہیں جس کا حقیقت سے تعلق نہیں۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء کے اعداد و شمار کو چیلنج کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کے ذمہ دار ترجمان نے کہا ہے کہ متحدہ عرب امارات کے ۲۰۰۴ء کے متعلقہ زمانے میں برآمدات صرف ۷ ملین ڈالر تھیں جو اس سال ۶۰ ملین ڈالر دکھائی گئی ہیں حالانکہ حقیقت میں اس عرصہ میں برآمدات ۵ ملین ڈالر سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح سعودی عرب کو ۱۰ ملین ڈالر برآمدات دکھائی گئی ہیں، جب کہ گذشتہ سال ۲ ملین ڈالر تھیں اور اس سال بھی اس سے زیادہ نہیں۔ یہی صورت حال جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک کی ہے۔ مختلف صنعتوں کے نمایندوں کا اندازہ ہے کہ صرف زیادہ قیمت کے بلوں (over-invoicing) کی بنا پر برآمدات کے اعداد و شمار میں ۱.۵ بلین ڈالر سے ۲ بلین ڈالر تک مصنوعی اضافے کا امکان ہے۔ اس طرح اصل برآمدات ۱۷ یا ۱۸ نہیں ۱۵ یا ۱۶ بلین ڈالر رہوں گی۔ (دی نیوز، ساجد عزیز، ۱۲ مئی ۲۰۰۶ء۔ ڈان، ۸ مئی ۲۰۰۶ء)

اس کے ساتھ اگر اس رپورٹ کو بھی سامنے رکھا جائے کہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو (CBR) کے ایک سابق ملازم نے ذمہ دار حضرات سے گٹھ جوڑ کر کے موجودہ حکومت کے دور میں ۲۰۰۲ء تک ۲۰ ارب روپے refund کے ذریعے نکلوائے۔ گویا ایک طرف برآمدات کو بڑھا کر دکھایا گیا اور دوسری طرف ان کے نام پر refund کی صورت میں اربوں روپے حاصل کیے۔ یہ بدعنوانی (corruption) اور ملی بھگت (collusion) کی صرف ایک مثال ہے۔

وزیراعظم صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۵ء میں معیشت کا حجم دگنا ہوگیا ہے لیکن اگر اقتصادی سروے اور اسٹیٹ بنک کی رپورٹوں میں اضافے کی سالانہ رفتار کا مطالعہ کیا جائے تو ۰۱-۲۰۰۰ء میں اضافہ ۸ء۱فی صد' ۰۲-۲۰۰۱ء میں ۱ء۳فی صد' ۰۳-۲۰۰۲ء میں ۱ء۵ فی صد' ۰۴-۲۰۰۳ء میں ۴ء۶ فی صد اور ۰۵-۲۰۰۴ء میں ۴ء۸ فی صد تھا۔ اس کا مجموعی input ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ یہ صرف شماریات کے لیے بنیادی سال کی تبدیلی اور افراط زر کا پیدا کردہ مغالطہ ہے۔ اسے معیشت کے حقیقی طور پر دگنا ہوجانے کا نام دینا یا صریح غلط بیانی ہے اور یا معیشت کے حقیقی نمو اور مالی شعبدہ بازی کے فرق کو نظرانداز کر کے عوام کو بے وقوف بنانا۔

جس ملک کے اعداد وشمار اور معاشی ٹیم کی ترک تازیوں کا یہ حال ہو' اس کی قیادت کے خوش نما دعووں پر کون اعتماد کرے گا۔

۲- ہم دلیل کے لیے تسلیم کرلیتے ہیں کہ صدر اور وزیراعظم صاحبان معیشت کی ترقی کی جس رفتار کا دعویٰ کر رہے ہیں' وہ درست ہے یعنی ۰۵-۲۰۰۴ء میں یہ رفتار ۴ء۸ فی صد سالانہ تھی اور سال رواں میں ہدف تو ۷ فی صد کا تھا مگر توقع ۳ء۶ سے ۸ء۶ کے درمیان کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اضافے کے مآخذ (sources) کیا ہیں اور ان میں کتنا دخل حکومت کی پالیسیوں کا ہے اور کتنا بیرونی (exogenous) عوامل کا۔ ڈاکٹر شاہد جاوید برکی نے نہایت علمی انداز میں یہ تجزیہ کیا ہے اور ۰۵-۲۰۰۴ء کے ۴ء۸ فی صد اضافے کو تحلیل کر کے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس اضافے کے چار مآخذ ہیں جن میں سے دو بیرونی اور ایک اتفاقی ہے۔ رہا چوتھا ماخذ تو وہ بلاشبہہ معیشت کی پیداواری صورت ہے۔ پہلا سبب موسم اور قدرت کی کرم فرمائی ہے جس کا خصوصی اثر

زرعی پیداوار پر پڑتا ہے اور اس سال کی زرعی پیداوار میں ۷ فی صد اضافے میں ان قدرتی عوامل کا بڑا دخل تھا جس کا مجموعی قومی پیداوار (GDP) اضافے پر ۵ء۱ فی صد کی حد تک اثر متعین کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا اہم بیرونی سبب بیرون ملک سے آنے والی ترسیلات ہیں جو اس زمانے میں ایک ارب ڈالر سے بڑھ کر ۴ ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہیں اور بڑی حد تک نائن الیون کے اثرات کی وجہ سے ہیں۔ اس میں کوئی دخل حکومت کی کسی پالیسی کا نہیں ہے۔ اس ذریعے کا عملی اثر جی ڈی پی پر ۲ فی صد کے قریب شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان دو عوامل کے علاوہ ایک اندرونی پہلو اور بھی تھا جو دوبارہ پیش نہیں آسکتا۔ یعنی یہ کہ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۳ء تک آئی ایم ایف کے دباؤ تلے جو پالیسی اختیار کی گئی اس کی وجہ سے stabilization کے نام پر نمو کو suppress کیا گیا۔ یہ suppressed growth ۲۰۰۲-۰۳ء کے بعد اپنا اظہار کرتی ہے اور اس طرح ۲۰۰۴-۰۵ء کے اضافے میں ۵ء۱ فی صد اس کا دخل نظر آتا ہے۔ اگر ان ۵ فی صد کو الگ کیا جائے تو اصل اضافہ صرف ۳ء۴ فی صد کا ہے جسے structural growth کہا جاسکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ۷ اور ۸ فی صد مسلسل اضافے کی توقعات لگانا سائنسی اعتبار سے درست نہیں۔ دوسرے معاشی ماہرین نے بھی ان پہلوؤں کو قابلِ غور قرار دیا ہے اور حکومت کے اس دعوے کو محل نظر قرار دیا ہے کہ مروجہ پالیسیوں کے پس منظر میں کُل پیداوار میں ۷ اور ۸ فی صد سالانہ اضافہ تسلسل کے ساتھ برقرار رکھنا ممکن ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیٹ بنک نے ۷ فی صد کے ہدف کو قابلِ حصول قرار نہیں دیا اور سال رواں کے لیے ۶ء۳ فی صد کے لگ بھگ اضافہ کو ممکن قرار دیا ہے اور اس میں بھی بیرونی ترسیلات کے تقریباً ۲ فی صد حصہ کو بیرونی عامل کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا۔

ہم نے یہ فنی تجزیہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ عام آدمی تو ۷ اور ۸ فی صد اضافے سے مرعوب ہوسکتا ہے لیکن جن کی نگاہ تمام معاشی عوامل پر ہے' وہ sustained rate of growth کے نقطۂ نظر سے ایک دو سال کے رفتارِ اضافہ کو economic break through تسلیم نہیں کرسکتے۔

اسی طرح فنی اعتبار سے یہ ایک معما ہے کہ معاشی ترقی کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے وہ ملک میں بچت کی شرح (rate of domestic saving) اور

سرمایہ کاری کی شرح (rate of investment) ہے۔ پاکستان میں بچت کی شرح نہ صرف یہ کہ علاقے کے تمام ہی ممالک کے مقابلے میں کم ہے بلکہ مالی سال ۲۰۰۳ء میں جو بچت کی شرح مجموعی قومی پیداوار کا ۲۰٫۸ تھی وہ ۲۰۰۴ء میں ۱۸٫۷ اور ۲۰۰۵ء میں ۱۵٫۱ رہ گئی۔ اس طرح ملک میں سرمایہ کاری کی شرح مطلوب شرح سے نمایاں طور پر کم ہے۔ ۷ فی صد کی رفتار سے جی ڈی پی میں تسلسل کے ساتھ اضافے کے لیے موجودہ incrementel capital output ratio کے مطابق ۳۰ فی صد شرح سرمایہ کاری مطلوب ہے جب کہ یہ شرح ۲۰ فی صد سے بھی کم ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجموعی قومی پیداوار (GDP) کی نسبت سے domestic investment ratio میں ۲۰۰۱ء کے مقابلے میں کمی آئی ہے جس کی تلافی بیرونی ترسیلات اور بیرونی سرمایہ کاری (FDI) جس میں نج کاری سے حاصل شدہ رقم بھی شامل ہے' نے کی ہے۔ لیکن دونوں مل کر بھی مطلوب شرح سرمایہ کاری سے نمایاں طور پر یعنی تقریباً ۳۰ فی صد کم ہیں۔

ان حالات میں جو بھی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے وہ بڑی حد تک consumption based ہے مطلوبہ حد تک investment based نہیں جو بہت fragile ہے اور لمبے عرصے کے لیے قابلِ اعتماد نہیں۔ ان بنیادی معاشی حقائق کی روشنی میں ترقی کے خوش کن دعوے اور break through اور turning the corner کے مبالغہ آمیز بیانات سیاسی نعروں اور تعلّیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

۳- ہم نے خالص علمی اور فنی نقطۂ نظر سے جو معروضات پیش کی ہیں ان کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ حکومت کے دعووں کی زمینی حقائق سے تائید نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ تو علمی بحث ہے۔ عام آدمی کی دل چسپی مجموعی پیداوار کی شرح نمو یا زرمبادلہ کے ذخائر میں افزونی نہیں___ اسے تو اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی' بنیادی سہولتوں کے حصول اور روزگار اور خوش حالی کے پیمانے پر حکومت کی معاشی پالیسیوں کی کامیابی یا ناکامی کو جانچنا ہوتا ہے اور اس اعتبار سے عام آدمی کی زندگی معاشی محرومی' استحصال اور ظلم کی تلخیوں سے بھری پڑی ہے۔ غربت کی شرح ۳۰ سے ۴۰ فی صد تک پہنچ چکی ہے اور حکومت کے ان دعووں میں کوئی صداقت نہیں کہ ۲۰۰۱ء کے مقابلے میں ۲۰۰۵ء میں ۷ فی صد کی کمی ہوئی ہے۔ حکومت کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہی ہے' کسی کو علم نہیں اور بار بار کے

مطالبات بلکہ سینیٹ اور قومی اسمبلی کی مالیاتی کمیٹی کے متعین مطالبے کے باوجود نہ تو تفصیلی رپورٹ فراہم کی گئی ہے اور نہ ہی اس کے طریق کار (methodolgy) کو ظاہر کیا گیا۔ ورلڈ بنک اور ایشین ڈویلپمنٹ بنک نیز ABN-Amro بنک کی رپورٹ میں غربت کو ۳۲ فی صد ہی دکھایا گیا ہے حتیٰ کہ پلاننگ کمیشن کے دس سالہ وسط مدتی منصوبے میں جو ۲۰۰۵ء میں آیا تھا اور حکومت کے غربت میں کمی کے دعوے کے بعد شائع ہوا ہے، غربت کی شرح کو آبادی کا ایک تہائی قرار دیا گیا ہے۔ ابھی امریکی مجلہ فارن پالیسی نے جو Failed States Index شائع کیا ہے اس میں بھی پاکستان میں ۳۲ فی صد غربت کی بات کی ہے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنومکس کے اپنے جائزے کے مطابق بھی غربت ۳۲ فی صد سے ۳۷ فی صد تک ہے۔

غربت کا مسئلہ اوّلین معاشی مسئلہ ہے۔ پیداوار میں وہ اضافہ جو امیروں کی ضروریات کو پورا کرے یا مبادلہ خارجہ کمانے کا ذریعہ ہو، عوام کے لیے غیر متعلق ہے۔ ان کی ضرورت یہ ہے کہ زندگی کی بنیادی ضروریات اور سہولتیں قابلِ برداشت قیمت پر حاصل ہوں، یعنی رسد بھی کافی ہو اور قیمت بھی ان کی دسترس میں ہو --- اور اس وقت دونوں ہی مفقود ہیں۔

ایک زرعی ملک جو تقسیم سے قبل پورے ہندستان کی ضروریات پوری کر رہا تھا اور ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء میں بھی بڑی حد تک زرعی اجناس کی حد تک خودکفیل ہوگیا تھا اب گندم، چینی، پیاز، ٹماٹر اور دالوں تک کے لیے دوسروں کا محتاج ہوگیا ہے اور تمام ہی ضرورت کی اشیا کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں قیمتیں دوسرے ممالک سے کم ہیں لیکن حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ ہم صرف پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت میں چند اشیاے ضرورت کی قیمتوں کے تازہ ترین اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جو انٹرنیٹ سے حاصل کیے گئے ہیں اور پاکستان کی کرنسی میں اپریل کے آخر اور مئی ۲۰۰۶ء کے شروع کی معلومات فراہم کرتے ہیں:

اشیا	پیمانہ Unit	اسلام آباد (۰۴-۰۵-۰۶)	ڈھاکہ (۲۷-۰۴-۰۶)	نئی دہلی (۲۷-۰۴-۰۶)
آٹا	کلوگرام	۱۳،۱۶	۱۶،۹۴	۱۶،۴۴
ماش کی دال	"	۷۵،۵۰	۴۶،۵۹	۸۲،۲۰
گائے کا گوشت	"	۱۳۷،۵۰	۱۱۸،۶۰	۵۱،۳۷

بکری کا گوشت	کلوگرام	۲۵۷٫۵۰	۱۶۹٫۴۳	۲۶۵٫۵۰
چینی	"	۳۷٫۸۸	۴۹٫۱۳	۳۰٫۱۴
سویابین تیل	لٹر	۸۲٫۰۰	۴۶٫۵۹	۶۱٫۶۵
آلو	"	۲۶٫۵۰	۱۱٫۸۶	۱۳٫۷۰
پیاز	"	۱۹٫۲۵	۱۳٫۵۵	۱۰٫۹۶
پٹرول	"	۵۷٫۷۷	۳۸٫۱۲	۶۱٫۳۸
ڈیزل	"	۳۸٫۸۰	۲۵٫۴۱	۴۲٫۵۴
مٹی کا تیل	"	۴۰٫۰۰	۲۹٫۶۵	۴۹٫۳۲
LPG	کلوگرام	۴۳٫۶۴	۲۲٫۷۷	-
CNG	کیوبک میٹر	۳۱٫۳۷	۶٫۳۱	۲۴٫۶۶
DAP	کلوگرام	۲۳٫۰۰	۱۲٫۷۹	-
یوریا	"	۱۱٫۰۰	۴٫۲۴	-
سیمنٹ	فی بوری	۳۲۵٫۰۰	۲۳۷٫۲۱	۲۲۱٫۹۴

اس جدول سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے عام شہری کو بحیثیت مجموعی اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنگلہ دیش کے مقابلے میں دگنا اور بھارت کے مقابلہ ایک تہائی زیادہ قوت خرید درکار ہے، جب کہ عام آدمی کی اوسط آمدنی ان ملکوں میں برابر برابر ہے۔ اقبال نے صحیح کہا تھا ؂

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

پاکستان میں کم سے کم اُجرت قانونی طور پر ۳۰۰۰ روپے ماہانہ ہے لیکن عملاً اس سے نصف اور دو تہائی پر بھی بڑی تعداد کو کام کرنا پڑتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جس خاندان کی آمدنی ۵ ہزار ماہانہ سے ۱۰ ہزار تک ہے وہ بھی اس آمدنی میں ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کرسکتا۔ اور اس بنیاد پر ملک میں غربت کی سطح کی گرفت میں ۶۰ اور ۷۰ فی صد آبادی آجاتی ہے۔

یہی وجہ ہے یو این کے Human Development Index میں دنیا کے ۱۷۷ ممالک میں پاکستان کا نمبر ۱۳۵ واں ہے اور گذشتہ ۶ سال میں ہم نیچے گئے ہیں، اُوپر نہیں آئے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ رخ رفیع خاں کی کتاب *Hazardous Home Based Labour*

جسے اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا ہے' اس میں بچوں کی لیبر کی جس زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے' وہ رونگٹے کھڑے کرنے والا ہے۔ کارپٹ' چوڑیوں کی صنعت' پلاسٹک' موم بتی بنانے کے کارخانوں میں ۸ سے ۱۲ سال کے لڑکے اور لڑکیاں تک ۱۶ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں اور ۷۰۰ سے ۲۰۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والوں کو ایک ہزار اینٹ بنانے کے ۶۰ روپے ملتے ہیں اور یہی ہزار اینٹ منڈی میں ۴ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ زراعت میں بھی چھوٹے کاشت کار اور مزارع کی حالت دگرگوں ہے۔ بظاہر زرعی اجناس کے لیے support price کا اعلان ہوتا ہے مگر عملاً بڑا زمین دار ہی اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور چھوٹے کاشت کار کو جس کے اندر اپنی پیداوار کو روک رکھنے کی سکت نہیں' کم دام پر فروخت کرنا پڑتی ہے۔

پاکستان قومی ترقیاتی رپورٹ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر اکمل حسین نے Asymmetric Markets for Inputs and Outputs میں جو حقائق پیش کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا کاشت کار مجبُور ہوتا ہے کہ اپنی پیداوار کو بڑے زمین دار کی پیداوار کے مقابلے میں سستا بیچے اور جو زرعی ضروریات اسے درکار ہیں وہ بڑے زمین دار کے مقابلے میں مہنگی حاصل کرے جس کے نتیجے میں انھی اشیا کی خرید وفروخت پر چھوٹے کاشت کار کو بڑے زمین دار کے مقابلے میں اوسطاً ۳۴ فی صد کم آمدن ہوتی ہے یا ۳۳ فی صد زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

شہری آبادی کے بارے میں بھی متعدد جائزے یہ حقیقت سامنے لاتے ہیں کہ گذشتہ ۱۰ سال میں حقیقی اُجرت (real wages) کم ہوئی ہے اس میں اضافہ نہیں ہوا جو غربت میں اضافے کا باعث ہے۔

روزگار کے سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ بے روزگاری جتنی زیادہ آج ہے' پہلے کبھی نہیں تھی۔ نیز روزگار کی فراہمی کے جو وعدے کیے جا رہے ہیں' ان میں صداقت نہیں۔ ایک تو روزگار کی تعریف ہی نہایت ناقص ہے یعنی اگر ایک شخص کو ہفتے میں دس گھنٹے کا کام بھی مل جائے تو وہ برسرِ روزگار ہے حالانکہ اتنے گھنٹے کا کام پیٹ بھرنے کے لیے آمدن نہیں پیدا کرسکتا۔ پھر ایک عجیب وغریب قسم برسرِ روزگار کی بنائی گئی ہے یعنی unpaid house labour اور ملک میں جن

۲۳ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے ان میں سے ۱۱ لاکھ سے زیادہ کا تعلق اسی unpaid house labour سے ہے۔

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیے؟

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کی صورت حال لیبر سروے کے تجزیہ پر مبنی ڈاکٹر جنید احمد کے ایک مضمون کے مطابق کچھ یوں بنتی ہے کہ ۲۰۰۲ء کے مقابلے میں ۲۰۰۶ء میں میٹرک تک تعلیم پانے والوں کی بے روزگاری میں ساڑھے دس فی صد اضافہ ہوا ہے' جب کہ اس عرصے میں گریجویشن یا اس سے اُوپر تعلیم حاصل کرنے میں سوا اٹھارہ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ دوسالوں کے دوران ان تعلیم یافتہ بے روزگاروں میں ۲۴ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ ۳۷ لاکھ بے روزگاروں میں سے ۱۳ لاکھ بے روزگار ایسے ہیں جنھوں نے میٹرک سے زیادہ اور گریجوایشن سے کم تعلیم حاصل کی ہے۔

اُجرت کی کمی' قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ' سرکاری طور پر فراہم کی جانے والی خدمات کا فقدان یا ان کی ناگفتہ بہ حالت جیسے تعلیم' علاج کی سہولت' صاف پانی کی فراہمی' مکان' سڑکوں اور روشنی تک رسائی' ان سب کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہے کہ عام آدمی کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوگیا ہے اور ایمان کی کمزوری اور اخلاقی زوال کے اس دور میں مسلمان معاشرے میں ان حالات کے ردعمل میں ایک طرف تخریب کاری' چوری' ڈاکا اور قتل وغارت گری طوفان کی شکل اختیار کر رہے ہیں تو دوسری طرف مایوسی اور بے بسی کی وہ کیفیت رونما ہو رہی ہے جو جسم فروشی اور خودکشی کی طرف لے جارہی ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ حکومت اور معاشرے کے متمول طبقات پر آتی ہے۔

حکومت کے کرتادھرتا کتنے ہی بغلیں بجائیں' حقیقت یہ ہے کہ یونیسف (UNICEF) کی تازہ ترین رپورٹوں کے مطابق پاکستان اور جنوب ایشیا میں under nourished اور under weight بچوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے یعنی پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں یہ شرح ۴۶ فی صد ہے جو دنیا کے اوسط سے تقریباً دگنا ہے۔ پاکستان میں ان بچوں کی تعداد ۸۰ لاکھ کے قریب ہے۔ (ڈان' ۳۰ مئی ۲۰۰۶ء)

تعلیم کے لیے وسائل بڑھانے کے تمام دعووں کے باوجود ورلڈ بنک کی تازہ ترین رپورٹ Little Green Book 2006 کے مطابق پاکستان میں تعلیم پر اخراجات قومی پیداوار کے تناسب سے کم ہیں یعنی ۲ء۳ فی صد' جب کہ جنوب ایشیا کا اوسط ۳ء۶ فی صد اور پوری دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک کا اوسط ۳ء۴ فی صد ہے (ڈان' ۱۲ مئی ۲۰۰۶ء)۔ اور بات صرف تعلیم کے بجٹ کی نہیں اس بجٹ کا استعمال' کرپشن' اسکولوں کی زبوں حالی' اساتذہ کا فقدان اور بے توجہی' تعلیمی معیار کی پستی اور شکستہ حالی سب کے سامنے ہے۔

وزیراعظم صاحب دعویٰ کر رہے ہیں کہ پرائمری عمر کے طلبا کا ۸۶ فی صد اسکولوں میں جا رہا ہے' جب کہ ورلڈ بنک کی یہ رپورٹ کہہ رہی ہے کہ اس عمر کے بچوں کا صرف ۵۰ فی صد تعلیم کی سہولت تک رسائی پا رہا ہے یعنی ۵ سے ۹ سال کے بچوں کی موجودہ تعداد ۲ کروڑ کا صرف نصف تعلیم حاصل کر رہا ہے اور ان میں سے بھی اسکول چھوڑ جانے والوں (drop outs) کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک جائزے کے مطابق پانچویں تک آتے آتے تعداد نصف رہ جاتی ہے۔

کراچی ملک کا امیر ترین شہر ہے' اس کے ایک حالیہ جائزے کے مطابق شہر کا ۵۵ فی صد کچی آبادیوں پر مشتمل ہے جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ (ڈیلی ٹائمز' ۴ مئی ۲۰۰۶ء) اور پورے ملک کے بارے میں جائزے بتا رہے ہیں کہ آبادی کا ۵۹ فی صد آلودہ پانی استعمال کر رہا ہے جو پیٹ کی بیماریوں کا بڑا سبب ہے۔ (ڈیلی ٹائمز' ۳۱ دسمبر ۲۰۰۵ء)

یہ ہیں عام آدمی کی زندگی کے حالات ___ نہ پیٹ بھر کر روٹی میسر ہے' نہ صاف پانی' نہ گھر کی سہولت حاصل ہے' نہ تعلیم اور صحت کی۔ اور حکومت دعوے کر رہی ہے کہ ہم آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں اور زمین پر دودھ کی نہریں بہا دی ہیں۔

۴- معاشی صورت حال کا ایک دوسرا دل خراش پہلو دولت کی ناہمواری' معاشرے کی طبقاتی تقسیم' اور حکومت کی وہ سوچی سمجھی پالیسی ہے جس کے نتیجے میں پیداوار میں نام نہاد اضافہ' بیرونی تجارت کا فروغ اور زرمبادلہ کے ڈھیر اصل ہدف ہیں' جب کہ غربت کا خاتمہ' روزگار کی فراہمی' دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف اور ضروریاتِ زندگی پر مبنی آمدنی پالیسی (income policy) کا فقدان ہے۔ سرمایہ داری اپنی بدترین شکل میں پروان چڑھائی جا رہی

ہے۔ آزاد معیشت' منڈی کا نظام' نج کاری (privatization) اور de-regulation کے نام پر ایک استحصالی معیشت کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک اشرافی معیشت (elitist economy) وجود میں آئی ہے جس میں دولت کا ارتکاز ایک محدود طبقے کے ہاتھوں میں ہو رہا ہے اور عام افراد غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ چند لاکھ گھرانے ہیں جو دولت کے تمام وسائل پر قابض ہیں اور ان کا پُرتعیش طرزِ زندگی اسراف اور تبذیر کی بدترین مثال ہی پیش نہیں کر رہا بلکہ معاشرے میں طبقاتی منافرت پھیلانے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ حکومت اور اس کے کارپرداز جس طرزِ زندگی کو فروغ دے رہے ہیں اور جو مثال قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور سرکاری وسائل کو جس بے دردی سے عیش و عشرت اور نام و نمود کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے' وہ ایک طرف قومی وسائل کے ضیاع کا باعث ہے تو دوسری طرف قوم کے محروم طبقوں میں نفرت کی آگ سلگا رہا ہے اور معاشرے کو تصادم کی طرف لے جا رہا ہے۔ صرف چند حقائق پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اس خطرناک صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسٹیٹ بنک نے ملک میں بنک کاری کے نظام اور کارکردگی کے بارے میں جو تازہ ترین اعداد و شمار جاری کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جون ۲۰۰۱ء میں ملک کے تمام بنکوں میں کل کھاتہ داروں کی تعداد ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۰۷ ہزار تھی جو جون ۲۰۰۵ء میں کم ہو کر ۲ کروڑ ۶۹ لاکھ ۸۰ ہزار رہ گئی۔ اصل کمی ان کھاتہ داروں میں ہوئی ہے جن کے ڈپازٹ ۴۰ ہزار روپے یا اس سے کم تھے اور اس کے برعکس اضافہ ان میں ہوا ہے جن کے ڈپازٹ پانچ لاکھ روپے یا اس سے زیادہ ہیں۔ ایسے افراد کی تعداد ایک لاکھ ۸۳ ہزار سے بڑھ کر ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ہو گئی ہے۔ بنک نج کاری کے بعد جس طرح اپنے کھاتہ داروں کا استحصال کر رہے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۱ء میں کھاتہ داروں کو جو نفع دیا جا رہا تھا اگر اسے افراطِ زر سے adjust کر کے real return متعین کی جائے تو وہ صرف ۰ء۶ تھی مگر اب ۲۰۰۵ء اور اس کے بعد کے اعداد و شمار کی روشنی میں کھاتہ داروں کی real return منفی ہے یعنی ۸ء۵-۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنکوں کا spread یعنی جس شرح پر وہ کھاتہ داروں کو نفع/سود دیتے ہیں اور جس شرح سے advance پر سود وصول کرتے ہیں وہ ۷ اور ۵ء۷ فی صد ہے جو دنیا میں کہیں نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ۲۰۰۶ء کے پہلے تین ماہ میں بنکوں کے نفع

میں ۲۰۰۵ء کے پہلے تین ماہ کے نفع پر ۵۸ فی صد اضافہ ہوا ہے اور یہ رقم ۱۴ ارب روپے بنتی ہے۔ اس طرح اگر ۲۰۰۵ء میں بنکوں کے نفع کا جائزہ لیا جائے تو ۲۰۰۴ء کے مقابلے میں ۹۸ء۷ اضافہ ہوا۔ ٹیکس ادا کرنے کے بعد یہ نفع ۵ء۴۷ ارب روپے تھا۔ واضح رہے کہ بنکوں کے ٹیکس کی شرح کو بھی گذشتہ سالوں میں کم کیا گیا ہے جو ۴۵ فی صد سے کم کر کے ۳۸ فی صد کر دیا گیا ہے اور دعویٰ ہے کہ آیندہ سال مزید ۳ فی صد کم کر دیا جائے گا۔

بنک تو پھر بھی کچھ ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں جو سٹہ کا کاروبار ہو رہا ہے اور جس میں گذشتہ ۶ سال میں کراچی اسٹاک ایکسچینج کا index جو ۱۹۰۰ تک گر گیا تھا‘ بڑھ کر ۱۱۰۰۰ سے تجاوز کر گیا ہے۔ چند بڑے بڑے کھلاڑی ہیں جنھوں نے اربوں روپیہ بنالیا ہے‘ جب کہ ہزاروں عام سرمایہ کار ہیں جو بالکل لٹ گئے ہیں۔ سینیٹ کی مالیاتی کمیٹی کی تجویز تھی جسے سینیٹ نے باقاعدہ حکومت کو بھیجا تھا کہ اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار پر capital gains tax لگایا جائے مگر سرمایہ پرست لابی نے اسے نامنظور کر دیا بلکہ اسٹاک ایکسچینج کے لیے جو نگران ادارہ ہے جب اس نے بڑی مچھلیوں پر گرفت کی ہلکی سی کوشش کی تو اس کے سربراہ کو بیک بنی و دو گوش کوئی وجہ بتائے بغیر برطرف کر دیا گیا۔ اسی طرح زمینوں کی قیمتوں کا مسئلہ ہے جس میں land mafia نے اربوں روپے کمائے اور کوئی ٹیکس نہیں‘ نگرانی کا کوئی نظام نہیں۔ پچھلے سال میں زمین کی قیمتیں ۱۰ سے ۲۰ گنا بڑھ گئی ہیں اور ایک عام آدمی کے لیے گھر بنانے اور سر چھپانے کا اہتمام کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے اور یہ تمام طبقات ٹیکس کی گرفت سے ہی باہر ہیں۔

قیمتی ترین کاروں کی ریل پیل ہے۔ ہر مہینے ہزاروں کاریں سڑکوں پر آرہی ہے اور ایک سے ایک قیمتی کار درآمد کی جارہی ہے۔ گذشتہ سال صرف کاروں کی درآمد پر ایک ارب ڈالر سے زیادہ صرف ہوا ہے۔ جو کاریں ملک میں بنائی جارہی ہیں ان کے لیے مشینری اور پرزوں کی درآمد کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ رقم دگنی ہو جاتی ہے۔ اس پر مستزاد اسمگل شدہ گاڑیوں کی مالیت بھی اربوں میں ہے۔ سڑکوں کی جو حالت ہے‘ پٹرول کی درآمد سے جو بوجھ ملک کے زرمبادلہ پر پڑ رہا ہے فضا کو خراب کرنے اور آلودگی کے جو تباہ کن اثرات ہو رہے ہیں ان سب کا معاشی پالیسی بنانے والوں کو کوئی ادراک نہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام بری حالت میں ہے۔ ریل کی ترقی کے

لیے کوئی منصوبہ نہیں۔ شرم کا مقام ہے کہ جو ۵ ہزار کلومیٹر ریلوے لائن ۱۹۴۷ء میں تھی ۲۰۰۶ء میں بھی وہی ہے۔ اس میں چند کلومیٹر کا اضافہ نہیں ہوا' جب کہ بھارت میں ۳۰ ہزار کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ٹرین سروس عام آدمی کے لیے ٹرانسپورٹ کا موثر اور سستا نظام فراہم کر رہی ہے۔ پھر ان کے کرایوں میں بھی بین الاقوامی قیمتوں کا نام لے کر اضافہ روز مرہ کا معمول ہے مگر انرجی پالیسی اور ٹرانسپورٹ پالیسی کا فقدان ہے اور ایسی جامع پالیسی (comprehensive policy) کا تو کوئی تصور ہی نہیں جو مواصلات کے جملہ پہلوؤں' وسائل اور کم سے کم لاگت کو سامنے رکھ کر بنائی جائے۔

سرکاری وسائل کو جس بے دردی سے استعمال کیا جارہا ہے اس کا اندازہ صرف ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیراعظم کے اخراجات اور وزرا کی فوج ظفر موج پر کیے جانے والے اخراجات پر ایک نظر ڈالنے سے کیا جاسکتا ہے۔ صرف ان دو عہدوں پر فائز انسانوں پر روزانہ ۲ لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہو رہا ہے' جب کہ ایک عام شہری کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں۔ صدر' وزیراعظم' وزرا' ارکان پارلیمنٹ اور سرکاری عہدہ داروں کے صرف اس سال کے بیرونی سفر کے اخراجات کا جو تخمینہ سلطان احمد نے ڈان میں پیش کیا ہے اس نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ڈان کا کالم نگار لکھتا ہے کہ صرف پچھلے چھے ماہ میں ۷۰ء۵ ملین ڈالر ان شاہانہ اسفار پر خرچ ہوئے ہیں۔ سرکاری استعمال کے لیے ۶۰ مرسڈیز سال گذشتہ میں منگوائی گئی تھیں' اب اسمبلی کے اسپیکر اور سینیٹ کے چیئرمین متمنی ہیں کہ ان کی پرانی مرسڈیز متروک کر دی جائیں' سوا سو کروڑ کی نئی مرسڈیز خریدی جائیں۔ اسپیکر اسمبلی اپنے لیے ۱۰ کروڑ کا مکان بنوانا چاہتے ہیں۔ نئے وزیروں کے لیے ۲۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے Minister's Enclosure میں اضافے کے لیے منظور کیے گئے ہیں۔ اسلام آباد میں بڑے لوگوں کے لیے H-11 میں ایک سوشل کلب بنانے کے لیے ایک ارب روپے کا منصوبہ ہے۔ کراچی میں کراچی پورٹ کے سامنے سمندر میں ایک ۶۲۰ فٹ اُونچا فوارہ ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے سے بنایا ہے جو کام نہیں کر رہا۔

اور اس قیادت کے ذہنی افلاس اور اخلاقی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے اپنے تازہ ترین فرمان کے ذریعے صدر مملکت' وزیراعظم اور چاروں گورنروں کے لیے خصوصی احکام جاری کیے ہیں کہ ان کے لیے منگوائے جانے والے غیرملکی سگریٹ اور سگار فیڈرل ایکسائز

ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہوں گے۔(ڈان، ۱۴ مئی ۲۰۰۶ء)

ایک طرف غربت، افلاس، بے روزگاری، بے چارگی اور دوسری طرف اسراف، تبذیر، عیاشی اور دولت کی نمایش کا یہ ہولناک تفاوت ہے جو ملک کی معیشت ہی نہیں معاشرے کی تمام اقدار کو گھن کی طرح کھا رہا ہے اور بے چینی اور اضطراب کے اس لاوے کی پرورش کر رہا ہے جو نہ معلوم کب آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔

۵- بین الاقوامی تجارت کا خسارہ جو اس سال بڑھ کر ۱۰ سے ۱۲ بلین ڈالر کی حدوں کو چھونے والا ہے اور سابقہ سال کے مقابلے میں دگنا ہو گیا ہے اور جس کے نتیجے میں توازن ادایگی بھی اب اتنے خسارے میں جا رہا ہے جو ۴ سے ۵ بلین ڈالر ہو سکتا ہے، جو سابقہ سال کے خسارے کے مقابلے میں تین گنا ہے، خطرے کی ایک اور گھنٹی ہے۔ بیرونی قرضوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوئی اور اندرون ملک قرضوں میں اضافہ ہوا ہے اور بجٹ کا خسارہ بھی تقریباً دگنا ہو گیا ہے۔ اپنے وسائل سے بڑھ کر رہن سہن (living beyond means) کی پالیسی تباہ کن ہے لیکن معاشی ترقی کے نشے میں مست قیادت ان تمام warning signals کو نظرانداز کیے ہوئے ہے اور ملک کو بہت ہی خطرناک صورت حال کی طرف لے جا رہی ہے۔

پانی کی قلت کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے مگر اسے بھی سیاست کی نذر کر دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ گذشتہ ۷ سال سے آپ حکمران ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کیا اقدام کیے؟ ترجیحات کے تعین اور قومی اتفاق راے پیدا کرنے کے لیے کیا مساعی کی گئیں؟ پانی کے صحیح استعمال کے طریقوں کو رائج کرنے کے لیے کیا کیا گیا؟ پانی کا مسئلہ آج آپ کے علم میں آیا ہے؟ قیمتوں کے سلسلے میں بھی جنرل مشرف صاحب نے ۱۶ مئی ۲۰۰۶ء کو ایک خطاب میں فرمایا ہے کہ کھانے کی اشیا کی قیمتوں میں ۵۰ فی صد کمی کر دی جائے گی۔(ڈیلی ٹائمز، ۱۷ مئی ۲۰۰۶ء)

سبحان اللہ! گویا صرف آپ کے حکم کی کمی تھی۔ لیکن اس فرمان کے جاری فرمانے میں اتنی تاخیر کیوں کی جا رہی ہے؟

چینی کا بحران آج بھی موجود ہے اور اب جو بحث اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور وزیر تجارت کے درمیان اخبارات میں ہو رہی ہے، اس نے اس حکومت کے سارے کرداروں کو

بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ کس طرح ذاتی منافع کے لیے سرکاری پالیسیوں کو تبدیل کیا گیا' بنکوں کو استعمال کیا گیا' درآمد کی جانے والی چینی کو بھی سرکار میں بیٹھے ہوئے مل مالکوں نے اپنے لیے نفع اندوزی کا ذریعہ بنایا' نیب نے مداخلت کی تو اس کو کان پکڑ کر باہر کر دیا گیا۔ آج بھی چینی ۳۷روپے کلو مل رہی ہے۔ پٹرول کی قیمتوں کا معاملہ بھی ایک اسکینڈل سے کم نہیں۔ اس حکومت کے دور میں ۴۵ بار اس میں اضافہ کیا گیا ہے اور صارف کو آج اس قیمت سے تین گنا زیادہ قیمت دینا پڑ رہی ہے جو ۱۹۹۹ء میں دے رہا تھا اور ستم یہ ہے کہ قیمت میں ۴۲ فی صد حصہ سرکاری ٹیکسوں کا ہے۔

پانچ سال پہلے اسی حکومت کی کابینہ نے طے کیا تھا کہ قیمتوں کا تعین تیل اور گیس کی اتھارٹی (OGRA) کرے گی مگر اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا۔ پٹرول کی قیمتیں غیرملکی کمپنیاں مقرر کرتی رہیں اور من مانی کرتی رہیں جن میں سیلز ٹیکس اور ایکسائز پر بھی اپنا کمیشن لینا شامل ہے جس مد میں ساڑھے چار ارب روپے پچھلے چند سالوں میں ان کمپنیوں نے عوام سے وصول کیے۔ جب اس راز سے پردہ اُٹھا تو کمپنیوں نے یہ رقم واپس کرنے کے بجاے مزید سرمایہ کاری نہ کرنے کی دھمکیوں سے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ نیب نے نوٹس لیا تو نیب کے پیچھے پڑ گئے اور خطرہ ہے کہ جس طرح چینی کے معاملے میں نیب کی انکوائری کو دفن کر دیا گیا' اس طرح اس معاملے کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔

۶- ایک اور اہم مسئلہ صوبوں کے ساتھ سوتیلی ماں سے بھی بدتر سلوک ہے۔ مرکز نے صوبوں کے وسائل پر قبضہ کر لیا ہے۔ سارے ٹیکس مرکز لگا رہا ہے اور جو ٹیکس ہمیشہ سے صوبوں کا حق تھے یعنی سیلز ٹیکس' اسی طرح صوبے کے قدرتی وسائل کی رائلٹی وغیرہ' یہ سب اب مرکز کی گرفت میں ہیں اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت تقسیم کا جو نظام تجویز کیا گیا ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا حتیٰ کہ این ایف سی ایوارڈ بھی معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ ٹیکس جمع کرنے پر مرکز جو کمیشن لیتا ہے وہ سی بی آر کے اصل اخراجات سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ مرکز نے صوبوں کو نقد ترقیاتی قرضے دیے ہیں وہ بالعموم رعایتی شرح سود پر باہر سے حاصل کیے گئے ہیں مگر مرکز صوبوں سے ۱۴ سے ۱۷ فی صد سالانہ سود وصول کر رہا ہے اور یہ قرضے ۲۰۰ بلین روپے سے متجاوز ہیں۔ صوبے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم سے قرض واپس لے لیں اس لیے کہ مارکیٹ سے وہ اس سے نصف شرح سود پر قرض لے کر

یہ رقم واپس کر سکتے ہیں لیکن ظلم ہے کہ ان کو قرض واپس کرنے کا حق بھی نہیں دیا جا رہا۔ این ایف سی کا جو من مانا (arbitrary) ایوارڈ صدر نے دیا ہے اس میں دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ صوبوں کو ۴۴ ارب روپے زیادہ مل رہے ہیں لیکن اس کی سزا یہ دی جا رہی ہے کہ سرکاری شعبے کے ترقیاتی پروگرام سے ملنے والی اس سے ۱۲ ارب زیادہ رقم یعنی ۵۶ ارب سے ان کو محروم کیا جا رہا ہے۔

خرابی کی جڑ دو چیزیں ہیں: ایک شخصی حکومت' پارلیمنٹ کی بے بسی' جمہوریت کا فقدان اور جواب دہی کا عدم وجود اور دوسرا معاشی پالیسی کے بنیادی نمونے (paradigm) کا بگاڑ' وژن کا افلاس اور حقائق سے بے تعلقی۔

دوسرے تمام معاملات کی طرح معاشی حالات کی اصلاح کا دارومدار بھی حقیقی جمہوری' عوام کی خادم اور عوام کے سامنے جواب دہ حکومت کے قیام پر ہے۔ ایسی حکومت کے ذریعے معاشی ترقی کے ایک بالکل دوسرے ماڈل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو پاکستان کو سرمایہ دارانہ نظام کا دم چھلہ نہ بنائے بلکہ خود انحصاری کی بنیاد پر عوام کی فلاح و بہبود اور انصاف اور عدلِ اجتماعی پر مبنی ایک ہمہ جہتی معاشی پالیسی تشکیل دے تاکہ معاشی ترقی اور استحکام کے ساتھ تمام انسانوں کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع ملے' اور ملک کے تمام باشندوں اور تمام علاقوں کے درمیان دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور وسائل حیات سب کے لیے یکساں طور پر اور وافر مقدار میں میسر ہوں۔ یہ اسلام کا تقاضا ہے' اور یہی ایک مہذب معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس انقلابی تبدیلی کے بغیر ہم اس دلدل سے نہیں نکل سکتے جس میں سیاسی طالع آزماؤں اور سرمایہ داری کے اسیر معاشی کارپردازوں نے اس ملک کو پھنسا دیا ہے۔ بقول اقبال ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اے میرے بھائی / میری بہن
اے اللہ عزوجل سے ڈرنے والے

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: اللہ تعالیٰ تمھیں دیکھ رہا ہے' اور جو کچھ تم خفیہ یا علانیہ کرتے ہو اسے جانتا ہے۔ ''وہ آنکھوں کی خیانت بھی جانتا ہے اور سینوں میں جو کچھ چھپا ہے' وہ بھی''۔(المؤمن ۴۰:۱۹)

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: فرشتے تمھارے کُل اقوال و اعمال سے واقف ہیں اور انھیں تمھارے نامۂ اعمال میں لکھتے ہیں۔ ''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو''۔(قٓ ۵۰:۱۸)

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: قبر کو' اس کے عذاب کو اور اس کے اندھیرے کو' پھر وہ جنت کا ایک باغیچہ ہوگا' یا آگ کا ایک گڑھا۔ پھر اس وقت نہ تم پر باپ شفقت کرے گا اور نہ ماں رحم کرے گی۔

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: اس دن کو جب سورج سروں کے عین اوپر ہوگا (بالکل قریب ہوگا) اور لوگ اپنے اعمال کے بقدر پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ٹخنوں تک' بعض گھٹنوں تک اور بعض حلق تک ڈوبے ہوں گے اور بعض لوگوں کو تو پسینے نے لگام دے رکھی ہوگی۔ (العیاذ باللہ)

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: تم نے جو کچھ بھی نیکی یا برائی کی ہے' اس پر تمھارے اعضا گواہی دیں گے۔ ''پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں''۔(حم السجدۃ ۴۱:۲۰)

اللہ کی نافرمانی کرنے سے پہلے یاد کرلو: اس دن کو جب مجرمین کہیں گے: ''ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں جو اس میں درج نہ کی گئی ہو۔ جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا''۔(الکہف ۱۸:۴۹)

(خیر خواہ)

حکومت اور عوام کے رویے

مسلم سجاد

عامر عبدالرحمٰن چیمہ کی شہادت نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک برقی رو دوڑا دی۔ ہر صاحبِ ایمان کے دل کا وہ تار چھڑ گیا جو اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کا مظاہرہ لاکھوں افراد کے اس عظیم الشان ہجوم سے ہوا جو محض اپنے جذبے کی کشش سے، کسی باقاعدہ اعلان و پروگرام اور کسی مہم اور کوشش کے بغیر انتہائی گرم موسم میں خود ہی شہید کے گاؤں سارو کی، گوجرانوالہ پہنچا۔

ہماری قومی زندگی کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ حکمرانوں کے جذبات اور ترجیحات، ان کے مقاصد اور عزائم پاکستان میں بسنے والے عوام کے جذبات اور اُمنگوں کے بالکل مخالف اور متصادم ہیں۔ سید مودودی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تقریر اسلام عصرِ حاضر میں، میں فرمایا تھا کہ آزادی کے بعد مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ آپس کی کش مکش ہی سب سے اہم ترین سرگرمی ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت قوم کی توانائیوں کو کھا جاتی ہے اور عام معاشی ترقی کا ہدف بھی حاصل نہیں ہو پاتا۔

ہمارے ملک میں اس وقت سرفہرست یہی مسئلہ ہے۔ حکومت کو فکر ہے کہ دنیا کے سامنے پاکستان کا 'سافٹ امیج' پیش کیا جائے۔ اس کے لیے حکومتی سطح پر اور حکومت کی سرپرستی میں طرح طرح کی سرگرمیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن کسی ایسے مظاہرے سے، جو عامر شہیدؒ کی تدفین کے موقع پر ہوا، حکمران طبقے کی ساری کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے اور پاکستان کا حقیقی امیج دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔

توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے موقع پر بھی دنیا نے یہی دیکھا کہ عوام مطالبہ کر رہے ہیں اور حکومت احتجاج کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ جب سے ہمارے فوجی حکمران نے افغانستان پر حملے کے لیے اپنے کندھے پیش کیے' ایک کے بعد ایک ایسے اقدامات ہو رہے ہیں جو عوام کی مرضی کے خلاف ہیں۔ 'روشن خیالی' اور 'اعتدال پسندی' کے نام پر وہ کچھ ہو رہا ہے جسے پاکستانی عوام کا اجتماعی ضمیر تسلیم نہیں کرتا۔ احتجاج ہوتے ہیں' ان پر کان نہیں دھرا جاتا۔

ہمارے حکمران بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کوئی عام ملک نہیں۔ یہ دو قومی نظریے کے حوالے سے لا الٰہ الا اللّٰہ کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ اگر یہاں روزِ اوّل سے اس کے مطابق کام کیا گیا ہوتا تو مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) ہم سے جدا نہ ہوتا اور پاکستان اس علاقے کی ایک اہم طاقت ہوتا۔ لیکن حکمرانوں نے عوام سے لڑکر' ان کے خوابوں اور اُمنگوں کے خلاف پالیسیاں اختیار کر کے' آج پاکستان کو امریکا کی تابع فرمان اور بھارت کے مقابلے میں نہایت کم تر حیثیت کی ریاست کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

اگر آج پاکستان میں عوام کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی نمایندہ قیادت برسرِ کار ہوتی تو عامر چیمہ شہیدؒ کے جنازے کا مکمل اہتمام سے استقبال کیا جاتا' اہلِ خانہ کی مرضی کے مطابق اور سہولتیں فراہم کر کے راولپنڈی میں نماز جنازہ ادا کی جاتی' اور اس طرح دنیا کو یہ پیغام دیا جاتا کہ یہ اُمت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کے معاملے میں کتنی حساس اور یک زبان ہے— اور اس حوالے سے حکومت اور عوام میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہمارے حکمران ایک ایسی کوشش میں مصروف ہیں جس کے لیے بالآخر ناکامی مقدر ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کو کھرچ کر پھینکا نہیں جاسکتا۔ یہاں مائیں اپنی لوریوں کے ساتھ اللہ کی بندگی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا درس دیتی ہیں۔ ملک کا نظامِ تعلیم ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی تربیت دینے والا ہو تو ہر نوجوان ملکی طاقت وقوت کا ایک خزانہ ہے' لیکن اگر تعلیم مخالف سمت کی دی جائے تو نوجوانوں کی طاقت کش مکش کی نذر ہو جاتی ہے۔

عامر شہیدؒ کے جنازے سے اربابِ حکومت کی آنکھیں کھل جانا چاہییں کہ یہ قوم کس طرح سوچتی ہے' اس کی طاقت کا اصل منبع کیا ہے' اسے کس رخ پر آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ انھیں یہ نہیں

بھولنا چاہیے کہ اگر وہ عوام کی مرضی کے مطابق نہ چلیں تو انھیں ملک پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انھیں خود سمجھنا چاہیے‘ کہ جب عوام ان پر نفرین بھیج رہے ہوں‘ ان کے برسرِ حکومت رہنے کا کوئی جواز نہیں۔

اگر پاکستان کو اقوامِ عالم میں اپنا حقیقی مقام حاصل کرنا ہے‘ اس کے قیام کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں‘ انھیں برگ و بار لانا ہے‘ اگر یہاں کتاب و سنت کی فرماں روائی قائم ہونا ہے‘ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق حکومت کی جائے۔ یہی جمہوریت کی بھی روح ہے۔ جمہوریت یہ نہیں کہ زور زبردستی سے انتخابات کے ذریعے ٹھپا لگوا لیا جائے۔ عامر شہیدؒ کے جنازے اور اس سے پہلے خاکوں کے مسئلے پر جو احتجاج ہوا‘ اس نے بتادیا ہے کہ ملک کے عوام کس طرح سوچتے ہیں‘ کیا چاہتے ہیں۔ اگر شفاف انتخابات میں ان کی عکاسی ہو تو ملک کا نظام درست ہو اور پاکستان ایک باوقار اسلامی جمہوری ملک بنے۔

پاکستان کو قائم ہوئے ۶۰ برس ہونے کو ہیں لیکن یہاں کی بیوروکریسی نے اس ملک کے نظریے کو پنپنے نہیں دیا بلکہ قوم کو انتشار اور بے مقصدیت کا زہر دیے رکھا۔ آج پوری دنیا میں ڈکٹیٹروں کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے۔ یہاں کے اقتدار پر قابض ٹولے کو بھی ہوش کے ناخن لینے چاہییں کہ ملک کو اپنی جاگیر نہ سمجھیں ورنہ دوسرے ممالک میں کامیاب عوامی احتجاج کے نتیجے میں آمریتوں کے خاتمے کی مثالوں میں پاکستانی عوام کے لیے کرنے کا بہت کچھ سبق موجود ہے۔

کامیابی کے زینے

56

صفحۂ ہستی پر جا بجا ایسے عظیم افراد کے نقوش بکھرے ملتے ہیں جو معمولی پس منظر کے حامل ہونے کے باوجود اپنی محنت اور کارکردگی کی بدولت امتیازی تشخص کے حامل افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیش تر نے تاریخ انسانی پر اَنمٹ نقوش چھوڑے اور بہت سوں نے تاریخ میں نئے ابواب رقم کیے۔ ایسے ہی ۱۰۰ افراد کا چند ماہرین نے تجزیہ کیا اور درج ذیل خصوصیات کسی نہ کسی درجے میں ان سب میں مشترک پائیں۔

۱- **تلاشِ بصیرت**: انسانی فکر کی معراج' متاعِ بصیرت کی تلاش اور علم کے حصول کے لیے عملی طور پر کوشاں رہنا ہے۔ عمومی حالات و واقعات اور معاملات و مسائل کا گہرائی اور وسعت کے ساتھ احاطہ کرنا اور فکری اور ذہنی صلاحیتوں کا بدرجہ اتم استعمال ہی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔

۲- **تلاشِ خودی**: اپنے آپ سے واقفیت' اپنے وجود کی حقیقی معرفت' اپنی شخصیت کی مکمل سوجھ بوجھ' اپنے کام کی پہچان اور جائزہ' اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کی پہچان اور اپنی خامیوں اور عیوب پر گہری نظر کے مسلسل عمل کے ذریعے عظیم افراد اپنی شخصیت اور مقاصد کے مابین ربط قائم کرتے ہیں جو اخلاص اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ غرور' تحکم' خودپسندی اور احساس کمتری جیسے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے خوداعتمادی کے ساتھ اپنی شخصیت کو آئینے کی طرح شفاف رکھتے ہیں۔ عظیم لوگ اپنی ذات سے فرار نہیں چاہتے نہ فاصلہ ہی رکھتے ہیں بلکہ ہردم اس کے تعاقب میں رہتے ہیں۔

۳- **تلاشِ کمال**: عظیم لوگ کم اہمیت کے مقابلے میں اہمیت' عامیت کے مقابلے میں خاصیت اور گزارے پر اکتفا کے بجائے کمال پر فنا ہوجانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایسی ترجیحات اپناتے ہیں جس کے نتیجے میں اُن کے اندر سب کچھ سمیٹ لینے کے بجائے کچھ کے حصول کے لیے بہت کچھ چھوڑ دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت اُن کے کمال کی محتاج ہوتی ہے جو بالآخر انھیں برتری دلاتی ہے۔

۴- **تلاشِ وسائل**: کسی کام کے سوچنے سے لے کر ہونے تک کے عمل میں ایک اہم عنصر وسائل کا ہے جس میں مستحکم ارادے اور پُرعزم استقلال کے علاوہ انسانی و مادی اور فکری و عملی تمام تر ضروری اسباب شامل ہوتے ہیں۔ عظیم انسان وسائل سے مالامال ہوکر عظیم نہیں بنتے بلکہ تلاش بصیرت' تلاش خودی اور تلاش کمال کے نتیجے میں دستیاب وسائل کے موثر استعمال سے بتدریج آگے بڑھتے ہیں۔

۵- **تلاشِ جدت**: عظیم انسان زیادہ کام' مشکل کام' بہتر کام اور مسلسل کام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کا بنیادی وصف ان کے کام میں موجود جدت و ندرت ہوتی ہے۔ وہ لکیر کے فقیر بن کر اور پرانے منصوبوں کے تابع ہوکر وقت گزارنے کے بجائے نئے امکانات کی جستجو میں رہتے ہیں اور نئے مواقع کو نئے طریقوں سے اپنے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنابل العلم

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے واپسی میں حضرت اسامہؓ کے انتظار کی خاطر دیر فرمائی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک چپٹی ناک والے سیاہ رنگ کے نوجوان (اسامہؓ) آپہنچے (تو آپؐ چل پڑے)۔ یمن کے لوگوں نے (جو اس موقع پر موجود تھے کراہت کا اظہار کرتے ہوئے) کہا: اچھا! ہمیں اس شخص کی خاطر روکا گیا (یعنی اس حقیر چپٹی ناک اور کالے رنگ والے نوجوان کے سبب جو کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے)۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ نے کہا کہ یمن والے اس تحقیر آمیز جملے کی پاداش میں کافر ہو گئے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے 'کافر ہو گئے' کا مطلب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جو لوگ مرتد ہو گئے تھے' ان میں یمن کے وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے نبی اکرمؐ کے طرزِ عمل اور حضرت اسامہؓ کی شان میں یہ توہین آمیز جملہ زبان سے نکالا۔ اسی کا وبال ان پر مرتد ہو جانے کی شکل میں پڑا۔ (ابن سعد، ج ۴' ص ۴۴)

آج کل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس' آپؐ کے فرامین' اسلامی اقدار و روایات' دین اسلام اور اس کے احکام' داڑھی' پردہ' پگڑی اور جہاد وغیرہ کی توہین ہو رہی ہے۔ اسلام پر عمل پیرا اور اسلامی نظام کے علم برداروں کی تحقیر و تذلیل کی جارہی ہے۔ ان پر 'دہشت گرد'، 'انتہا پسند' وغیرہ کی پھبتیاں کسی جارہی ہیں۔ توہین کے مرتکب ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلت و رسوائی' بدامنی' قحط سالی' معاشی بدحالی' قتل و غارت گری' دہشت زدگی' اور طرح طرح کی آسمانی آفات و بلیات' طوفان باد و باراں'

زلزلوں وغیرہ سے دوچار ہونے کے علاوہ دلوں کی سیاہی، کفروشرک، گمراہی، الحاد وارتداد جیسے وبالوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، جو دنیاوی وبالوں سے بڑا وبال ہے۔ اس لیے کہ یہ آخرت جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، کی بربادی کا ذریعہ ہے اور انھیں دوزخ کا ایندھن بناتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی توہین، آپؐ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والے، ناموس رسالتؐ کے تحفظ کے لیے آواز اُٹھانے والوں کی تحقیر کرنے والے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔ جو نام نہاد مسلمان ان جرائم کا مرتکب ہوگا تو وہ نعمت ایمان سے محروم ہوسکتا ہے۔ قرآن پاک بھی اس کی تائید کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے اُونچا نہ کرو اور ان سے اس طرح کی اُونچی آواز میں بات نہ کرو جس طرح تم ایک دوسرے سے اُونچی آواز میں بات کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے سارے اعمال ضائع ہوجائیں (اعمال میں ایمان بھی شامل ہے) اور تمھیں اس کا احساس تک نہ ہو (الحجرات ۴۹:۲)۔ ایمان والوں کے لیے اس میں تسلی بھی ہے کہ اگر وہ ناموس رسالتؐ اور اسلامی شعائر کی توہین کرنے والوں سے انتقام نہ لے سکے تو کوئی بات نہیں، وہ انتقام سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ خود انتقام لے لیں گے۔

○

حضرت طلقؒ سے روایت ہے کہ ایک آدمی ابودرداؓ کے پاس آیا اور کہا: آپ کا گھر جل گیا ہے۔ انھوں نے جواب میں فرمایا: میرا گھر نہیں جلا۔ پھر دوسرا آدمی آیا اس نے بھی یہی بات کہی۔ جواب میں حضرت ابودرداؓ نے فرمایا: میرا مکان نہیں جلا۔ پھر تیسرا آدمی آیا اور اسی طرح کی بات کہی تو حضرت ابودرداؓ نے جواب میں فرمایا: میرا گھر نہیں جلا۔ پھر چوتھا آدمی آیا اور اس نے کہا: اے ابودرداؓ! آگ بھڑک اُٹھی تھی اور آپ کے گھر کے قریب پہنچ گئی تھی کہ اس کے بعد بجھ گئی۔ حضرت ابودرداؓ نے فرمایا: مجھے پتا تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے گھر کو نہیں جلائے گا۔ اس شخص نے کہا: اے ابودرداؓ! ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ آپ کی دونوں باتیں 'میرا گھر نہیں جلا اور اللہ تعالیٰ نے میرے گھر کو نہیں جلانا' میں سے کون سی بات زیادہ عجیب ہے۔ حضرت ابودرداؓ نے فرمایا: کچھ دعائیہ کلمات ہیں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو آدمی صبح کو یہ کلمات پڑھے اسے شام تک کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی۔ وہ کلمات یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ ، عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ،

مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشأْ لَمْ یَکُنْ ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ، اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ، وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَمِنْ شَرِّ کُلِّ دَآبَّۃٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا ، اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ، اے اللہ! آپ میرے رب ہیں، تیرے سوا میرا کوئی معبود نہیں، میں نے تجھ پر بھروسا کیا' تو عرش کریم کا رب ہے۔ جو اللہ نے چاہا' ہوا' اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ نہیں ہے کوئی گردش اور قوت مگر اللہ بلند عظیم ذات کے ساتھ۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم کی بنیاد پر احاطہ کیا ہوا ہے۔ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس اور ہر جان دار کے شر سے' تو اس کی پیشانی کو پکڑنے والا ہے' میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔(بیہقی اسماء و صفات ، ص ۱۱۵)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر ایسا یقین ہو جس طرح حضرت ابودرداؓ کو یقین تھا تو حضرت ابودرداؓ کی طرح اس یقین کا پھل بھی ملتا ہے۔ دعا اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ مدد کرسکتے ہیں اور مدد کرتے بھی ہیں' تب اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا کامیاب و کامران ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں اپنا اثر دکھاتی ہیں اور وعدے پورے ہوتے ہیں لیکن اس صورت میں کہ اس کے تمام وعدے اور ہدایات پیش نظر رکھی جائیں۔ حضرت ابودرداؓ بھی انھی ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی تمام ہدایات اور وعدوں کو پیش نظر رکھا' ان کو پورا کیا' تب وہ یقین رکھتے تھے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوگا۔

○

حضرت ابی اسماءؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ یہ آیت فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ○ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ○ (پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ الزلزال ۹۹: ۷-۸) اتری۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیا ہم جتنی برائیاں کریں ان سب کو دیکھیں گے اور آخرت میں ان کی سزا پائیں گے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا میں جو تکلیف دہ حالات تمھیں پیش

آئے ہیں' یہ ان برائیوں کی سزا ہے جن کا تم سے ارتکاب ہو جاتا ہے' اور نیکیاں نیک لوگوں کے لیے آخرت کا ذخیرہ بن جاتی ہیں (وہ سب آخرت میں مل جائیں گی)۔ (کنز العمال، ج ۱' ص ۲۷۵)

اللہ تعالیٰ نیک لوگوں پر کتنے مہربان ہیں کہ ان کی نیکیاں آخرت کے لیے جمع ہو جاتی ہیں اور چھوٹی موٹی برائیوں کا حساب اسی دنیا میں تکالیف اور مصائب کی شکل میں بے باق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نیک لوگوں کو نیک کاموں میں فعال اور برائیوں سے اجتناب میں بیدار رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کو اپنا وظیفہ بنانا چاہیے۔

○

حضرت عبدالرحمٰن بن عائذؓ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی طرف لشکر روانہ فرماتے تو اسے ہدایت فرماتے: لوگوں سے الفت و محبت کا رویہ اختیار کر کے ان کو اپنے ساتھ مانوس کرو' اور ان پر حملہ اس وقت تک نہ کرو جب تک اپنی دعوت ان کے سامنے پیش نہ کرو۔ زمین پر مٹی کے گھروں اور خیموں میں رہنے والوں کو تم مسلمان بنا کر میرے پاس لاؤ' یہ مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ تم ان کے نوجوانوں کو قتل کر دو اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈیاں اور غلام بنا کر لے آؤ۔ (کنز العمال، ج ۳' ص ۱۵۲)

اصل کام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا مطیع فرمان بنانا' شیطان اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کرنا ہے تاکہ انسان اپنے مالک کے شکرگزار بنیں' اس کا حق ادا کریں' جنت میں جائیں' دوزخ کی آگ سے بچیں اور دنیا میں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ یہ انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا تقاضا ہے۔ دعوت کا کام خوش اخلاقی اور الفت و محبت کے ذریعے ہوتا ہے جو ہر دور میں جاری رہ سکتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر ملک میں رہ کر کیا جا سکتا ہے۔ قتال مخصوص حالات میں اور شرائط پورا ہونے پر کیا جاتا ہے۔ جب تک قتال کے حالات پیدا نہ ہوں اس وقت تک قتال معطل ہوتا ہے۔ آج جہاد بالقرآن ساری دنیا میں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے لیکن قتال صرف ان ممالک میں ان قوتوں کے خلاف ہے جنھوں نے اسلامی ممالک پر غاصبانہ قبضے کر لیے ہیں۔ اسے جہاد آزادی کہا جاتا ہے' جو حصول آزادی تک جاری رہے گا۔ جہاد بالقرآن پر توجہ دینے اور اس کو وسیع کرنے کے لیے پوری صلاحیتوں اور وسائل کو بروے کار لانا چاہیے۔ مسلمان ممالک میں سیکولر نظام کو ختم کرنا اور اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد بھی جہاد بالقرآن ہے۔ اس لیے ان ممالک میں انقلاب کے لیے تلوار اور بندوق اُٹھانا جائز نہیں ہے۔

تحریک اور رکنیت☆

خرم مرادؒ

اقامت دین کے لیے برپا تحریک اور رکنیت کے حوالے سے چند نکات پیش ہیں۔ اگرچہ یہ متنوع اور غیر مربوط ہوں گے مگر ان سب کا مقصد ایک ہی ہے۔

تحریک اسلامی

اس ضمن میں پہلی بات یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ تحریک اسلامی کا یہ پورا نظام ایک اجتہادی نظام ہے۔ اگر ہم قرآن و حدیث میں ان اصطلاحات کو تلاش کرنا چاہیں تو وہاں نہیں ملتیں۔ وہاں مومن، مسلم، متقی، محسن، یہ ساری اصطلاحات تو ملتی ہیں لیکن رکن، امیدوار، رفیق اور حامی کی اصطلاحات موجود نہیں ہیں، اور نہ کہیں یہ احکام ملتے ہیں کہ اس قسم کا نظام بنایا جائے۔ یہ بات میں نے شروع میں اس لیے کہی ہے کہ بنیادی طور پر دین کا کام کرتے ہوئے دو چیزوں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ ایک وہ چیز ہے جو انسانوں نے اپنے فہم، سمجھ بوجھ اور استنباط و اجتہاد سے وضع کی ہے، اور دوسری وہ چیز ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر دیا ہے۔ مثال کے طور پر پانچ وقت کی نماز اجتہادی نہیں ہے بلکہ منصوص ہے۔ اسی طرح سود کی حرمت اجتہاد نہیں منصوص ہے، جب کہ جو چیزیں اجتہادی ہیں وہ انسان کے اپنے فہم پر مبنی ہیں۔

☆ اس دور میں دین کے یہ تقاضے ہر مسلمان سے ہیں۔ جو انھیں پورا کرنے کا داعیہ رکھتے ہوں، آگے بڑھیں اور تحریک سے وابستہ ہو کر رکنیت اختیار کریں۔ (ادارہ)

اس لحاظ سے جب یہ نظامِ رکنیت بنایا گیا تو اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقامت دین فرض ہے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے اجتماعیت ناگزیر ہے، مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ چنانچہ اس اجتماعیت کو وجود میں لانے یعنی اسے عملی شکل دینے کے لیے ہم نے اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے اور اپنی سہولت کے مطابق جس نظام کو بہترین سمجھا، وضع کرلیا۔ چونکہ مقصد شریعت کا منصوص ہے، اس لیے رکنیت کی ایک دینی و شرعی حیثیت بھی ہوگئی۔

فریضہ اقامت دین

دوسری بات جو اس سلسلے میں ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ایک اور بھی دینی مقصد منصوص ہے جس کے لیے یہ رکنیت کا نظام اور تنظیم بنائی گئی ہے، اور وہ ہے اقامت دین کا فریضہ۔ اقامت دین کے فریضے کی ادایگی کے لیے اگر کوئی چیز ہر ایک پر فرض ہے تو وہ دعوت کا کام ہے۔ میں چاہوں گا کہ ان الفاظ پر آپ اچھی طرح غور وفکر کریں اور انھیں جذب کریں کیونکہ رکن بننے کے لیے جہاں جماعت اسلامی کا دستور چند بنیادی شرائط عاید کرتا ہے، اور رکن بننے کے بعد جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے اپنے سیرت و کردار میں بتدریج کچھ تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے، وہاں ہر رکن کے لیے وہ اس بات کو بھی لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف میں دعوت کا کام کرے، اور یہ کارِ دعوت اس کے لیے فرض ہے۔ لہٰذا ہر رکن داعی مبلغ ہے، اور شعبہ دعوت وتبلیغ ایک ایسا شعبہ ہے کہ جس کا ہر رکن اور ہر کارکن ممبر اور رکن ہے۔

اگر یہ دو چیزیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں واضح ہیں، تو پھر اس سے ہٹ کر کچھ اور چیزیں بھی ہیں جنھیں ہر رکن کو سوچ سمجھ کر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

نئے تہذیب و تمدن کی تعمیر

ہمارا رکنیت کا یہ نظام جو منصوص نہیں ہے، دراصل اس لیے بنایا گیا ہے کہ ہم جن حالات میں کام کر رہے ہیں، یہ وہ حالات نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے جب قرآن نازل ہوا اور سنت کی تدوین ہوئی۔ اُس وقت ایک بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ جو زوال پذیر ہو موجود نہیں تھا، بلکہ ایک طرف کفار تھے اور دوسری طرف مومن، نیز وحی الٰہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں براہِ راست

خدا کی رہنمائی موجود تھی ۔ ہمارے پیش نظر ایک بگڑا ہوا اور زوال پذیر مسلمان معاشرہ ہے جس کی اصلاح درپیش ہے۔ ہمیں جہاں ایک طرف حقیقی فہم دین، اہل علم اور علماے دین کی ضرورت تھی وہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ ہم کو تہذیبی اور تمدنی معمار بھی بننا ہے ۔ یہ الفاظ بھی ہمارے ہاں استعمال ہوئے ہیں کہ رکن وہ ہیں جو تہذیبی اور تمدنی معمار ہوں، جو دنیا کے اندر ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کے تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ان کی سیرت و کردار بھی ایسا ہو، جو اُن کی اپنی اخروی نجات کے لیے بھی ضروری ہے اور اسی سیرت و کردار کے بل پر وہ عوام کے قائد بھی بن سکیں، ان کی رہنمائی کر سکیں اور ان کے ملجا بن سکیں، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ عوام کے لیڈر بھی بنیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی اور اپنے بلند کردار کی جاذبیت کی وجہ سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکیں اور ان کی ذات عوام کا مرجع بن جائے۔ گویا وہ معاشرے سے الگ تھلگ اور کٹے ہوئے نہ رہیں، بلکہ لوگ خود ان کی طرف رجوع کریں کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے پاس ہم کو جانا چاہیے۔

یہ چند بنیادی پہلو 'رکنیت کیا اور کیوں' کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہر رکن کو انھیں سمجھنا اور جاننا چاہیے۔

تعمیر ذات

فریضہ اقامت دین اور دعوت الی اللہ کی ادایگی کے لیے پہلی ضرورت انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر ہے۔ اگر پیش نظر تہذیبی و تمدنی معمار بننا ہو تو اس کے لیے سب سے بڑھ کر اپنی ذات کی تعمیر ضروری ہے ۔ اگرچہ اپنی ذات کی تعمیر کوئی ایسی ضروری چیز نہیں ہے کہ جس میں آدمی گم ہو جائے اور کھو جائے، بلکہ رکنیت کا فارم بھر کے اور ضابطے کی کارروائی پوری کر کے، کتابیں پڑھ کے اور کچھ اجتماعات میں حاضری دے کے جو رکنیت حاصل ہوتی ہے وہ رکنیت ہمارا مقصود نہیں ہے۔ مقصود تو رکنیت کا وہ تصور ہے کہ یہ ایک فریضہ ہے، اور رکنیت کا یہ معیار مطلوب ہے کہ ارکان مثالی سیرت و کردار کے حامل ہوں تاکہ وہ تہذیبی و تمدنی معمار بن سکیں، اور انھیں عوام کی لیڈرشپ حاصل ہو سکے، یعنی اپنے اپنے دائرۂ اثر میں لوگوں کو اپنے پیچھے لے کر چل سکیں۔

مسلسل کوشش اور عمل

اس سلسلے میں بھی چند بنیادی باتیں جاننے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہوں' کہ ہماری ذات کی تعمیر صرف کسی اجتماعیت سے وابستہ ہو جانے سے ہو جائے گی تو میرا خیال ہے کہ یہ غلط فہمی ہوگی۔ اگرچہ اپنی ذات کی تعمیر کے لیے اجتماعیت میں شمولیت بڑی ضروری اور ناگزیر ہے اور انسان کی ذات ایسی ہے کہ اجتماعیت کے سانچے میں آکر ہی اس کی تعمیر ممکن ہے' لیکن اجتماعیت' وعظ و نصیحت' درس و تقریر اور کتاب اور لٹریچر' ان میں سے کوئی چیز بھی ذات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ سب بھی موجود ہوں تو ذات کی تعمیر میں نقص اور کمی رہ سکتی ہے۔ ذات کی تعمیر کے لیے سب سے بڑھ کر اپنی کوشش اور عمل کی ضرورت ہے۔ گویا کہ اپنے آپ کو خود سنبھالنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں بخشی ہیں۔ ہر نفس کے اندر اس نے اپنی روح پھونکی ہے' وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (صٓ ۳۸:۷۲)۔ ہر ایک کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کی صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے۔ ہر شخص کی ذات میں ایک دنیا مخفی ہے۔ ان سب صلاحیتوں سے کام لینا' ان کی تنظیم و تربیت کرنا' ان کو پروان چڑھانا' اپنی ذات کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ ملک کا انتظام اور دنیا کی امامت سنبھالنے سے پہلے' اپنی ذات کی امامت سنبھالنا اور اپنی ذات پر قابو پانا اور اس پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ضروری ہے۔

ہماری ذات ہمارا کردار اور شخصیت کیسی بھی ہو' ہمارا نام ارکان کی فہرست میں دیکھ کر فیصلہ نہیں ہوگا' بلکہ اعمال نامہ دیکھ کر فیصلہ ہوگا۔ اسی طرح ناظم کا اور شوریٰ کا فیصلہ بھی اس کی ترازو میں کوئی وزن نہ رکھے گا بلکہ اعمال کی شہادت ہی فیصلے کی اصل بنیاد ہوگی۔ اس حقیقت اور روح کو اگر آپ نے سمجھ لیا اور پالیا' تب ہی صحیح معنوں میں اپنی ذات کی تعمیر ہو سکے گی۔

اپنی ذات کی تعمیر و تربیت میں اگر صرف دو چیزوں پر خاص طور پر توجہ مرکوز رہے' تو اس کے اندر ساری چیزیں سمٹ آتی ہیں۔

لِلّٰہیت اور تعلق باللہ

پہلی چیز 'للّٰہیت' اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے' یعنی جو کام کریں اللہ کے لیے کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب خرابیاں اخلاص کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح اعمال میں جو وزن پیدا ہوتا ہے وہ اخلاص کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں خلافت کا وعدہ بھی اخلاص کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ جہاں لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ (النور ۲۴:۵۵۔ وہ انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔) کا وعدہ ہے وہاں یہ شرط بھی ہے: یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ (۲۴:۵۵۔یعنی صرف میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں)۔صرف اس صورت میں وہ ان کو زمین میں خلافت اور غلبۂ دین عطا کرے گا اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔ یہ اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کا نتیجہ ہے۔ پھر بڑے بڑے عوامی' سیاسی' دعوتی اور تنظیمی کاموں میں بھی یہی رنگ آئے گا۔ صبغت اللّٰہ اللہ کا رنگ غالب آئے گا' اور ان میں سے ہر ایک تربیت کا ذریعہ بنے گا۔ دوسری صورت میں اجتماعات میں لوگ آئیں گے اور اٹھ کر چلے جائیں گے۔ خَرَجُوْا کَمَا دَخَلُوْا جس طرح داخل ہوئے تھے' اسی طرح نکل کے چلے جائیں گے۔کوئی رنگ ان پہ نہیں چڑھے گا' اور کوئی چیز ان کے دلوں میں نہیں اترے گی۔

دراصل للّٰہیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اخلاص کا نام ہے۔اس کے بغیر دین کا کوئی کام نہیں ہوسکتا اور اللہ کے ہاں قبول بھی نہیں ہوسکتا۔مشہور حدیث ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ، کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔شہدا کی شہادت' مال داروں کا انفاق اور قرآن کے عالموں کا درس' ان میں سے کوئی بھی چیز ان کو فائدہ نہیں دے گی اگر اس کے ساتھ للّٰہیت اور اخلاص نہ ہو۔تحریک اسلامی سے وابستہ ہو کر جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں' اس سب کا ہماری ذات کے لیے آخرت میں اگر کوئی فائدہ ہے اور اگر دنیا میں بھی کوئی پھل ملے گا' تو وہ صرف للّٰہیت اور اخلاص کی وجہ سے ملے گا' خواہ ہم رکن ہوں یا نہ ہوں۔

تعلق باللہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق تو ایک الگ موضوع ہے۔ مختصراً میں اس کا بھی تذکرہ کرنا چاہوں گا۔اس ضمن میں چند چیزیں جو مختلف جگہوں پر مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہیں' ان میں سے صرف دو تین دعائیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ اندازہ ہو کہ کس قسم کا

بندہ بننا مطلوب ہے۔ ایک دعا کے چند جملے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ ذَکَّارًا ، میرے رب مجھے ایسا بنا دے کہ میں تجھے بہت یاد کروں۔

لَکَ شَکَّارًا ، اور بہت کثرت کے ساتھ اپنا شکر کرنے والا بنا دے۔

لَکَ رَھَّابًا ، تجھ سے بہت ڈرا کروں۔

لَکَ مِطْوَاعًا، تیری بہت فرماں برداری کیا کروں۔

لَکَ مُخْبِتًا اِلَیْکَ اَوَّاھًا مُّنِیْبًا (ترمذی) تیرے آگے جھکا رہوں اور آہ آہ کرتا ہوا تیری ہی طرف لوٹ آیا کروں۔

یہ ایک طویل دعا کا مختصر سا حصہ ہے۔ اس میں آپ کے سامنے پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسا تعلق مطلوب و مقصود ہے۔

ایک اور بڑی جامع دعا ہے: اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ، اے اللہ تو میرے دل کو منافقت سے پاک کر دے، یعنی کہیں پر بھی دورنگی نہ ہو، کہ زبان پر کچھ ہو اور عمل کچھ اور ہو، بلکہ یکسانیت ہو۔ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَا ، اور جو کام ہو اس کو ریا سے پاک کر دے، یعنی دکھاوے کے لیے نہ ہو۔ ہر کام میں صرف تیری رضا پر نظر ہو اور صرف تیرے لیے کام کروں۔ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ اور زبان کو جھوٹ سے پاک کر دے۔ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخَیَانَۃِ اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کر دے۔

ایک اور مختصر سی دعا ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ الرِّضَا بِالْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ ، (اے اللہ تو جو بھی فیصلہ کر دے، اس پہ مجھے راضی رکھ، اور موت کے بعد جو زندگی ہے اس زندگی کی لذت عطا کر)۔ گویا اصل مطلوب دنیا کی نعمتوں کی لذت نہیں بلکہ خدا کی رضا اور آخرت کی لذتیں ہیں۔ پھر فرمایا: وَلَذَّۃَ النَّظْرِ اِلٰی وَجْھِکَ الْکَرِیْمَ، (اور تیرے کریم چہرے کو دیکھنے کی لذت)۔ اس کے بھی دو معنی ہیں جو عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔ ایک تو یہ ہے کہ آخرت میں تیرے چہرے پر نظر جمانے کی جو مجھے لذت ملنے والی ہے، وہ مجھے عطا کر۔ لیکن آپ غور کریں تو اس کے ایک اور معنی بھی ہیں، یعنی یہ کہ دنیا کے ہر کام میں، تو اپنے چہرے پر نظر جما کے اپنی رضا طلب کرنے میں لذت پیدا کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام جبراً نہ ہو، مارے باندھے کا

نہ ہو۔ کوئی توجہ دلائے' کوئی ترغیب دے یا بالائی نظم کی طرف سے ہدایت یا سرکلر آئے تو کام ہو' بلکہ تیری رضا کی طلب میں ہو' یعنی یہ کہ جو ہو بس اسی کے لیے ہو جائے اور اس میں لذت پیدا کر دے۔ وَالشَّوْقَ اِلٰی لِقَآئِکَ، اور تیری ملاقات کا شوق۔

یہ تین دعائیں میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ ویسے تو بہت سی دعائیں ہیں۔ میں نے دعاؤں کو اس لیے وسیلہ بنالیا' کہ دعا دراصل اپنی دل کی پیاس کا نام ہے۔ انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی ضرورت کا اسے احساس ہوتا ہے۔ ان چھوٹی سی تین دعاؤں میں وہ تمام باتیں بیان ہوگئی ہیں جو للّٰہیت اور تعلق باللہ کے لیے ضروری ہیں اور جن کی پیاس ہونی چاہیے' بھوک ہونی چاہیے' طلب ہونی چاہیے' جستجو ہونی چاہیے۔

عدل اور احسان کا رویہ

میں دو چیزوں میں تعمیر کردار کو سمیٹنا چاہ رہا تھا۔ ایک چیز ''للّٰہیت'' اللہ کے ساتھ تعلق ہے' اور دوسری چیز مخلوق کے ساتھ عدل اور احسان کا سلوک۔

ہمارے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ''مخلوق کو ایذا نہ پہنچانا' یہ ساری شریعت کی بنیاد ہے''۔ حکم ہے کہ اگر تین آدمی ایک جگہ اکٹھے ہوں تو دو آدمی الگ ہو کر بات نہ کریں۔ بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح شادی' خاندان' تجارت' ریاست اور سیاست کے سارے اصول اسی بنیاد پر ہیں کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے تکلیف نہ پہنچے۔ حکم ہے کہ' ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون' مال اور اس کی عزت مکمل طور پر حرام ہے۔ ہمارے معاشرے میں خون بہانے کی نوبت تو بہت کم آتی ہے' اور شاید کچھ لوگ دوسروں کا مال بھی جائز ناجائز طریقے سے کھالیں لیکن کسی دوسرے کی عزت پر دست درازی بڑی عام ہے' جب کہ اسلام میں برائی کے ایک ایک رخنے کو بند کر کے مسلمان کی عزت کو بحال کیا گیا ہے۔

ایک تیسری بات بھی قابل غور ہے کہ تربیت کے لیے مصنوعی ذرائع کے بجائے فطری ذرائع پر انحصار کرنا چاہیے۔ تربیت کے لیے بڑے بڑے نصابوں اور تربیت گاہوں سے گزرنا بالکل ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ ان سب سے تربیت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ذرائع اہمیت

کے حامل ہیں۔ تربیت کا فطری طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ زندگی میں ان پہلوؤں پر توجہ مرکوز رہے' یعنی کہیں کسی کو مجھ سے تکلیف نہ پہنچ جائے' کسی کا دل خوش کر دوں' کسی سے مسکرا کے مل لوں' تو ان اعمال کی بنا پر بھی اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر سکتا ہے۔ کسی کے راستے سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دی جائے تو اس پر بھی جنت مل سکتی ہے۔ کسی کی زندگی میں کوئی آسانی پیدا کر دی جائے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا سکتی ہے اور اس کے قرب سے نواز سکتی ہے۔ اسی طرح اس کے ذکر' شکر اور خوف اور توبہ و استغفار کا معاملہ ہے۔ یہ سب چیزیں تربیت کا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ روزمرہ کام ہی جاری رہیں گے' اور معمول سے ہٹ کر کچھ نہ کرنا ہوگا' لیکن ان کے ذریعے سے ہر چیز میں وہ روح پیدا ہو جائے گی جو قلب کو آہستہ آہستہ صاف کرے گی' اس کو جلا بخشے گی اور کردار سازی کا ذریعہ ہوگی۔ ان سب باتوں کا تعلق ایک فرد کی ذات اور انفرادی تربیت سے ہے۔

دنیا کی امامت

تربیت کا دوسرا پہلو اجتماعیت سے متعلق ہے' اور وہ یہ کہ ہماری اصل ذمہ داری ایک نئے تہذیب و تمدن کی تعمیر ہے۔ اسلامی تحریک اسی لیے وجود میں آئی ہے۔ یہ سارے کام جن کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ کسی خانقاہ میں بھی ہو سکتے ہیں' اور اس سے قبل ان کو کرنے والے خانقاہوں میں ہی پائے جاتے تھے۔ اسی طرح علمِ دین کسی مدرسے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل چیز جس کی وجہ سے ہم سب جمع ہوئے ہیں' اور جس نے ہمارا آپس میں تعلق قائم کیا ہے' وہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہم دنیا کے اندر اللہ کے دین کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ امامتِ عالم پر ہماری نظر ہے' جیسا کہ مکہ اور مدینہ میں بالکل بے بس و بے کس اور مظلوم انسانوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ عرب و عجم اور قیصر و کسریٰ کے خزانے اور ساری دنیا ہمارے قدموں میں ہے۔ اسی لیے جیسے ہی وہ مدینہ سے نکلے تو ان کے ہاں یہ بحث نہیں چھڑی تھی کہ ہم سیاست میں پڑ گئے ہیں یا ہم فتوحات اور مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے ہیں' بلکہ اندلس کے ساحل تک پہنچ کر بھی یہی کہا گیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اس کے آگے بھی کوئی اور زمین ہے تو ہم وہاں بھی اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے ضرور پہنچ جاتے۔ یہ تحریک بھی دراصل اسی لیے بنی ہے'

اور اسی لیے آپ اس کا حصہ ہیں۔ اگر یہ مقصد ذہن سے محو ہو جائے تو پھر یہ تعلق باللہ اور یہ ساری چیزیں اگرچہ بڑی عمدہ اور بڑی اچھی ہیں اور ان شاء اللہ یہ نجات میں بھی مدد دیں گی' لیکن یہ مطلوب نہیں ہے۔ مطلوب تو دراصل غلبۂ دین اور ایک نئے تہذیب وتمدن کی تعمیر ہے۔

ہماری تحریک کا بنیادی مقصد اور اہم ترین کام تہذیب وتمدن کی تعمیر ہے۔ اسی لیے ہمارے لٹریچر میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہمیں قیادت کا منصب سنبھالنا ہے۔ ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھالنا ہے۔ آپ کی ذات عوام کا مرجع بن جائے' آپ تعمیر اقدار کے ساتھ ساتھ اجتماعی قیادت بھی سنبھالیں۔ آپ عوام کے لیڈر ہی نہیں' تہذیب وتمدن کے معمار بھی ہوں' اور بہترین سیرت کے حامل بھی ہوں۔ اس کے لیے اسی معاشرے سے ہم کو ہر اُس قوت کو جمع کر لینا اور اپنے ساتھ ملانا ہے جو معاشرے کی تبدیلی اور تہذیب وتمدن کی تعمیر میں ہمارا ہاتھ بٹا سکے۔

شہادت حق کا فریضہ

تحریک اسلامی سے وابستہ یہ گروہ اس لیے بھی نہیں ہے کہ اپنی ذات میں گم ہو جائے' اور اپنی تعداد سے مطمئن ہو جائے کہ ہم نے طے شدہ تنظیمی کام کر لیے ہیں اور یہ کافی ہیں۔ دراصل وہ تمام لوگ جن تک یہ دعوت نہیں پہنچی' وہ سب اس بات کے منتظر ہیں کہ ان تک یہ دعوت پہنچائی جائے۔ وہ قیامت کے روز ہمارا دامن پکڑ سکتے ہیں' یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ تمھارے پاس تو حق پہنچا تھا' مگر تم نے ہم تک اسے نہیں پہنچایا' تم نے ہم کو اپنے دامن میں نہیں سمیٹا' اور اپنے ساتھ لے کر دین کی راہ پر نہیں چلایا۔ یہ وہ چیز ہے جو سب سے اہم ہے' اور جس کے لیے یہ تحریک برپا ہوئی ہے اور جس کے بغیر ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

اخلاقِ حسنہ کی قوت

اس ضمن میں جو سب سے زیادہ کارگر چیز ہے وہ اخلاق حسنہ ہے۔ کوئی اور چیز اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی جتنا آپ کا اخلاق حسنہ ہو سکتا ہے۔ جو کام اخلاق حسنہ کر سکتا ہے' وہ کام نہ کتاب کر سکتی ہے' نہ تقریر' نہ وعظ اور نہ اجتماع ہی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہفتے میں دو دن سے زیادہ وعظ کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کا جمعے کا خطبہ بڑا مختصر ہوا کرتا تھا' نیز آپؐ جگہ جگہ تقاریر بھی

نہیں کیا کرتے تھے۔ اگر میری بات کو غلط نہ سمجھا جائے اور میں قرآن کی اہمیت کو کسی طرح بھی کم نہیں کر رہا' اگر سیرت النبیؐ کا جائزہ لیا جائے' واقعات کو دیکھا جائے' تو جو لوگ قرآن سن کر یا پڑھ کر ایمان لائے' ان کی تعداد انگلیوں پہ گنی جاسکتی ہے' جب کہ وہ لوگ جو حاملِ کتاب کا اخلاق اور چہرہ دیکھ کر ایمان لے آئے' وہ فوج درفوج تھے۔ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روشن چہرہ دیکھ کر ایمان لے آیا' کوئی آپؐ کا دل نواز حسنِ اخلاق دیکھ کر متاثر ہوگیا' کسی نے آپؐ کی فیاضی دیکھی' اور کسی کے سینے پہ آپؐ نے ہاتھ رکھ دیا اور اس کی ٹھنڈک محسوس کر کے وہ آپؐ کا گرویدہ ہوگیا۔ اس طرح بڑی تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے وہ قوت بنی جس نے اسپین سے لے کر چین تک اسلام کو غالب کر دیا۔

اگر آپ یہ چاہیں کہ معاشرے سے الگ تھلگ ہوکر اپنے تنظیمی کام میں مصروف رہیں' اور ایک بڑی تعداد میں عام لوگ' نوجوان' طلبہ و طالبات' مرد و خواتین آپؐ کے اس اخلاق کی ایک جھلک نہ دیکھ پائیں کہ جو نبی کریمؐ کے پاس تھا' تو پھر دعوت کا کام وسیع پیمانے پر اور اس مؤثر انداز میں نہیں ہوسکتا جو اس کا فطری تقاضا ہے۔

معاشرے کی استعداد

دعوت دین' شہادت حق اور فریضہ اقامت دین کی بہ احسن ادایگی کے مزید کچھ اور تقاضے بھی ہیں' ان کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے' مثلاً: معاشرے میں دعوت کو قبول کرنے کی استعداد۔

تہذیب و تمدن کی تعمیر' جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ معاشرے کے اندر ہوگی' لہٰذا معاشرے کے اندر اس کی استعداد پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے دین کی بنیادی تعلیم' اللہ سے محبت اور تعلّق' اور اللہ کے احکامات کی تعمیل کے لیے آمادگی' یہ وہ چیزیں ہیں جو معاشرے کے اندر عام ہونی چاہییں۔ اس لیے ہمارا اوّلین فرض معاشرے کی تربیت کرنا ہے۔ عام انسانوں میں دین پھیلانا ہے' ان کو تعلیم دینا ہے اور ان کی تربیت کرنا ہے۔

تعمیر معاشرہ کے حوالے سے یہ بنیادی بات بھی ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ معاشرہ کبھی

ایک سانچے میں نہیں ڈھل سکتا' تمام لوگوں میں کبھی ایک جیسی استعداد نہیں پیدا ہو سکتی' اور کبھی بھی سب لوگ ایک معیار کے نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم چاہیں بھی تو سب کو ایک جیسا نہیں بنا سکتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو متنوع اور مختلف سوچ و کردار کا حامل بنایا ہے۔ پھر انسانوں کو ضعیف پیدا کیا گیا ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ○ (النساء ۴:۲۸)، لہٰذا وہ ضعف اور کمزوری کا شکار ہوگا۔ انسان کو عجلت پسند بھی بنایا گیا ہے۔ وہ عجلت پسندی کا مظاہرہ بھی کرے گا۔ غرض انسان کا بہت سی کمزوریوں کا شکار ہونا فطری امر ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ انھی انسانوں سے ہمیں وہ قوت فراہم کرنا ہے جس سے ہم معاشرے کی تعمیر کر سکیں اور ایک نئی تہذیب و تمدن کی بنیاد اٹھا سکیں۔ اس حقیقت کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر ہم ہر ایک سے کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں' اور ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دے سکتے ہیں۔ اگر ہم ذروں کو جمع کر لیں تو پہاڑ بن جائے گا' اور قطرہ قطرہ دریا بن جائے گا۔ پھر یہی پہاڑ اور دریا بالآخر اس نظام کی حقانیت کو ثابت کر دیں گے' اور اس سیلاب سے پوری دنیا کے اندر اس دین کو پھیلا دیں گے جس کو ہم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ایک گروہ تیار کر لینے سے کام ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہوگا۔

معیارِ مطلوب

میرا یہ نقطۂ نظر قرآن و حدیث اور سیرت کے مطالعے' سوچ' فہم اور تجربے کی بنا پر ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کو میری اس بات سے اتفاق نہ ہو' لیکن مجھے اس لیے کامل یقین ہے کہ جب تک ہم یہ صلاحیت نہیں پیدا کریں گے کہ ہر قسم کے لوگوں کو ہمارے دامن میں پناہ ملے' گناہ گار بھی آئیں اور وہ بھی ہم سے نرمی اور محبت پائیں' اور ہم ان کو توبہ و استغفار کی تلقین کر سکیں اور وہ بھی ہمارے ساتھی بن سکیں' بے کس اور نادار آئیں وہ بھی ہمارے ساتھی بن سکیں ــــــ اس وقت تک کوئی بڑی تبدیلی لانا ممکن نہیں۔

دراصل یہ وہ چیز ہے جس سے ہم وہ قوت فراہم کر سکتے ہیں جو اس کام کو نتیجہ خیز اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس قوت کے حصول کے لیے بھی کچھ بنیادی اصول ہیں۔ اس حوالے سے مختصراً دو تین چیزیں بیان کر دیتا ہوں۔

دین میں آسانی اور تدریج

اس ضمن میں ایک اہم اصول تیسیرِ دین کا ہے۔ تیسیر عربی کا لفظ ہے جس کے معنی آسان کرنا اور آسان بنانا کے ہیں۔ حضوؐر نے اس کی بہت نصیحت کی ہے۔ جہاں بھی لوگوں کو مبلغ اور داعی بنا کے بھیجا وہاں اور باتوں کے علاوہ یہ ضرور کہا کہ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا ، یعنی دین اس طرح پیش کرو کہ لوگوں کو بشارت دو' آسانی دو تا کہ لوگ اسے قبول کریں اور ان کو متنفر مت کرنا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک جگہ بہت واضح طور پر فرمایا ہے کہ نیکیاں تو ہم وہی قائم کریں گے جن کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے' برائیاں بھی وہی جڑ سے مٹائیں گے جو اللہ اور رسولؐ نے بتائی ہیں' لیکن ہم اس میں تقدیم و تاخیر کر سکتے ہیں۔ البتہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کن نیکیوں کو ہم پہلے کریں گے اور کن کو بعد میں' کن برائیوں کو پہلے مٹائیں گے اور کن کو بعد میں' یہ فیصلہ ہم اپنے حالات اور اپنی قوم کی نفسیات کو دیکھ کر ہی کریں گے۔ اگر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھے بغیر' اور نفسیات کو جانے بغیر ہر ایک کو ایک ہی دوا دی جائے تو وہ غیر مؤثر ہو جائے گی۔ اسی طرح لوگوں کے مزاج کو جانے بغیر اگر عمل کی ترغیب دی جائے تو وہ اس پر عمل پیرا نہ ہوں گے۔

مؤثر تنظیم: ایک اہم پہلو

تنظیم کے حوالے سے میں دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ جان دار تنظیم وہ نہیں ہے جہاں سارا کام سرکلروں اور بالائی نظم کے حکم پر چلتا ہو۔ روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل میں سید مودودیؒ کے یہ الفاظ بڑے غور طلب ہیں: ''اصل میں تنظیم وہ ہے جو اُوپر کی ہدایات کے انتظار میں نہ ہو' بلکہ اصول و ضوابط معلوم ہوں' اور کوئی کہے یا نہ کہے لوگ خود صحیح فیصلے کر کے اپنا کام کریں''۔ جب ہر جگہ اس کی ضرورت پڑے کہ کوئی توجہ دلائے اور آگے بڑھائے تو کام ہو' تو یہ کوئی مؤثر تنظیم نہ ہوگی۔ اصل جان دار تنظیم تو وہی ہوگی کہ کسی بڑے سے بڑے معرکے میں اگر صرف ایک پلٹن بھی میدان جنگ میں ہو تو اس کو معلوم ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اگر کسی کمانڈر انچیف سے اس کا رابطہ نہ بھی ہو' تو پھر بھی وہ اپنی لڑائی لڑے۔ اس کو یہ معلوم ہو کہ کس طرح لڑنا ہے' کہاں سے

آگے بڑھنا ہے، اور کیا حکمت عملی اپنانی ہے۔ اس کے مقابلے میں جو پلٹن ہمیشہ اس بات کی منتظر رہے کہ وائرلس پر حکم آئے گا تو لڑیں گے، وہ پلٹن کسی بڑی جنگ میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کرسکتی۔ اگر تنظیم سازی اور تربیت میں اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ لوگ از خود کام کریں، بغیر اس کے کہ اوپر سے کوئی کہے یا توجہ دلائے۔ نیز ان ضوابط کی حدود میں رہیں جو ضوابط کام کرنے کے لیے متعین ہیں، تو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ ایسی تنظیم ایک مؤثر تنظیم کی طرح آگے بڑھ سکتی ہے۔

تنظیمی وسائل کا استعمال

یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ تنظیم از خود کوئی مقصد یا مطلوب نہیں ہے۔ اگر تحریک کے وسائل اور انسانوں کا بڑا حصہ تنظیم پر صَرف ہونے لگے، تو اس کے معنی ہیں کہ کہیں کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ اس لیے کہ اصل کام تو دعوت و تربیت، عوام کو تیار کرنا، منظم کرنا اور ان تک بات پہنچانا ہے۔ تنظیم تو اس کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ذریعہ ہی وسائل کا بڑا حصہ کھانا شروع کردے اور زیادہ تر وسائل اسی پر کھپنا شروع ہو جائیں تو یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر مسجد بنانے میں ہی سارا مال اور سب کچھ لگ جائے اور نماز پڑھنے کی فرصت ہی نہ ہو تو پھر مسجد بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حالانکہ مسجد تو بڑی محترم و مقدس جگہ ہے۔ لہٰذا یہ وہ پہلو ہے جو تنظیم کے بارے میں سامنے رکھنا بہت ضروری ہے کہ تنظیم دعوت کے کام اور اصل اہداف کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے، وسائل کا بڑا حصہ اس حوالے سے صرف ہو، نہ کہ تنظیم کو برقرار رکھنے میں۔

اصول اور حکمت عملی کا فرق

ایک اور اہم بات جو کام کرتے وقت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ تدبیر اور حکمت عملی ایک چیز ہے اور اصول ایک دوسری چیز۔ اس اصول کو سامنے رکھیں کہ زمانے اور حالات کے ساتھ، اگر تحریک میں اتنی اہلیت نہ ہو، اتنی قوت اور دماغی صلاحیت نہ ہو کہ اپنی سوچ، حکمت عملی اور تدابیر کو حالات کے لحاظ سے بدل سکے تو پھر مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں اس کی مثال ایک ایسے عطار کی ہوگی جس کے پاس نسخوں کی ایک کتاب ہو اور وہ اس کتاب سے ہر ایک کو ایک ہی نسخہ بنا کر دے رہا ہو، یہ جانے بغیر کہ مرض کیا ہے، اس کی حالت کیا ہے، کن مسائل کا اسے سامنا ہے،

کس مریض کو کس چیز سے پرہیز کرانا ہے' اور کس کو کس دوا سے فائدہ ہوگا' اگرچہ بظاہر مرض ایک ہی نظر آتا ہو۔ ایک ایسے عطار کی طرح جو حکمت سے خالی ہو اگر اسلامی تحریک بھی ہر قسم کے حالات میں ایک ہی حکمت عملی پر عمل پیرا رہے تو وہ دین کے کام کو آگے نہیں بڑھا سکتی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: جماعت اسلامی ، حکمت عملی اور لائحہ عمل' ترتیب : خرم مراد' ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۹۳ء)

غور کیجیے کہ حکمت اور حُکم دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں' دونوں کا ایک ہی مادہ ہے' یعنی ح' ک' م۔ حکمت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کریمؐ نے جہاں کتاب کی تعلیم دی وہاں حکمت کی تعلیم بھی دی۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (اٰل عمرٰن ۳:۱۶۴) ''وہ ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے''۔ میرے نزدیک یہاں کتاب کے معنی احکام کے ہیں' اور حکمت کے معنی دراصل ان احکام کو نافذ کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے جس سمجھ بوجھ اور فہم کی ضرورت ہے اس کے ہیں۔ حکمت کے بغیر صرف احکام سے کام نہیں کیا جاسکتا' حکمتِ دین کا فہم ناگزیر ہے۔ لہٰذا اپنی تدبیر اور حکمت عملی میں تغیّر وتبدل کی قدرت اور استطاعت رکھنا' یہ وہ چیز ہے جس کی دعوت دین اور اقامت دین کے فریضے کی ادائیگی کے لیے ہر لمحے ضرورت پڑتی ہے۔

داعیانہ اضطراب

اس کام کو کرتے ہوئے ایک بنیادی بات اضطراب اور بے چینی کا پیدا ہونا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کو مزید بہتر انداز میں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف جائزے میں لکھ دیا جائے کہ ہم کو کام بہتر سے بہتر انداز میں کرنا چاہیے' بلکہ واقعتاً ایک اضطراب اور بے چینی پائی جانی چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے بہتر ہونا چاہیے۔ اگر یہ احساس نہیں پایا جاتا اور یہ سوچ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے' ٹھیک ہو رہا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی منزل اور اپنے مقصد سے غافل ہیں اور ہمیں کوئی احساس نہیں ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جو عظیم الشان مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اور اللہ نے اقامتِ دین کی جو ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ڈالی ہے' اس کو بخوبی نبھانے اور اس کا حق ادا کرنے

کے لیے بہت کچھ سوچنے، مضطرب اور بے چین رہنے کی ضرورت ہے۔ نبی کریمؐ کس قدر مضطرب رہتے تھے، اس کی عکاسی اس آیت قرآنی سے ہوتی ہے: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ○ (الکہف ۱۸:۶)، گویا آپؐ اپنا گلہ گھونٹ ڈالیں گے اس بات کے پیچھے کہ سب لوگ مومن ہو جائیں، اور سب لوگ ہمارے ساتھ آجائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے۔ اس میں نہ کوئی ڈانٹ ہے اور نہ کوئی تنبیہہ، بلکہ بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔ حضورؐ کی بے پناہ خواہش تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح لوگ اسلام قبول کرلیں۔ اس کے لیے آپؐ بڑی تگ و دو کرتے تھے، اور مضطرب رہتے تھے۔ آپؐ کے اسی اضطراب کی بنا پر حضورؐ کو مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ تم چاہو تو سیڑھی لگا کے آسمان پہ چڑھ جاؤ، اور سرنگ کھود کے زمین میں گھس جاؤ، لیکن سب لوگ تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں''۔ یہ بھی کوئی تنبیہہ نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی جو قلبی کیفیت تھی، آپؐ کی جو نفسیات، اور آپؐ میں جو اضطراب اور بے چینی تھی، دل کی گہرائیوں سے آپؐ کی جو تڑپ تھی کہ لوگ میری بات مان جائیں اور نجات پالیں، یہ اس کی عکاسی ہے، اور بڑی خوب صورت عکاسی ہے۔ یہ ایک داعی کے اضطراب کی بہترین مثال ہے۔

اس راہ میں قناعت ایک کینسر کی مانند ہے، جب کہ اضطراب اور بے چینی وہ اصل قوت ہے جس سے کام آگے بڑھتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ کو حمد کے ساتھ استغفار کرنے کا حکم دیا گیا۔ لوگ جب فوج در فوج دین میں داخل ہو رہے تھے تو فرمایا: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط (النصر ۱۱۰:۳) ''پس آپ اپنے رب کی حمد کیجیے اور اس سے مغفرت مانگیے''۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے رب کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں ہدایت دی، حق کی راہ دکھائی، اس راہ پر چلایا، اس کا شعور بخشا اور اس کے لیے اضطراب اور بے چینی سے نوازا۔ یہ کوئی کم نعمت نہیں بلکہ بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن جتنی بڑی نعمت ہے اس کا اتنا ہی بڑا حق ہے۔ اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ اسی طرح جہاں شکر کرنے کی ضرورت ہے وہاں استغفار بھی کیجیے کہ جو حق ہے وہ ادا نہیں ہو رہا، اور اس راہ میں کوئی کمی کوتاہی ہو تو اسے اللہ معاف کر دے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کام کے کرنے پر کبھی اپنے اوپر یہ زعم نہ کیجیے کہ یہ کام ہمارے

کرنے سے ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کو زعم بڑا ناپسند ہے۔ اس سے سارا کام غارت ہو جاتا ہے۔ اللہ کو تواضع اور انکساری پسند ہے۔ کام تو اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ غزوہ بدر میں تم نے انھیں نہیں قتل کیا بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا' اور تم نے وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ گویا جو کام بھی ہوگا وہ اللہ کے کرنے سے ہوگا۔ اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ **ماشاء اللّٰہ ولا قوۃ الا باللّٰہ**، جو وہ چاہتا ہے وہی ہوگا۔ قوت اس کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا ہماری یہ سوچ ہونی چاہیے کہ دعوت دینے سے کسی کا دل نہیں بدلے گا' ہمارے کام کرنے سے کام نہیں ہوگا' بلکہ جو کچھ ہوگا اللہ کے کرنے سے ہوگا۔ اگر اضطراب اور بے چینی بھی ہوگی کہ ہم زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا کام کریں' نئی سے نئی تدابیر اختیار کریں' اور ساتھ ہی اپنے اوپر زعم نہ ہو کہ یہ کام ہمارے کرنے سے ہوگا' تو اس کے نتیجے میں تواضع وانکساری اور عاجزی بھی پیدا ہوگی۔

تحریکِ اسلامی اور رکنیت اور اس کے تقاضوں سے متعلق یہ چند باتیں ہیں۔ ان سے اختلافِ رائے بھی ہوسکتا ہے' مگر جو باتیں اچھی لگیں' ان کو قبول کرلیں اور ان پر عمل کیا جاسکے تو ضرور کیجیے۔ خدا ہمیں عہدِ رکنیت اور اس کے تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے اور فریضۂ اقامتِ دین کو احسن انداز میں ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین! (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

(کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مکمل متن کتابچے میں دستیاب ہے۔ تحریک اور رکنیت' منشورات' منصورہ' لاہور)

مجلس عمل کی پارلیمانی جدوجہد کے چار سال

لیاقت بلوچ

قراردادمقاصد اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ بات طے کردی گئی کہ پاکستان کے عوام اپنی قیادت اور پارلیمنٹ کا آزادانہ طریقے سے خود ہی انتخاب کریں اور اس بات کو بھی طے کر دیا گیا کہ پاکستان کے عوام کو اسلامی اصولوں کے مطابق پارلیمانی جمہوریت اور وفاقی نظام کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے ضمیر کے مطابق اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنا ہے۔ مگر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو چوتھی مرتبہ ملک پر جنرل پرویز مشرف کے ذریعے فوج ایک بار پھر اقتدار پر قابض ہوگئی۔ نواز شریف کو پارلیمنٹ کے اندر دوتہائی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن آئین سے ماورا اقدام اٹھاتے ہوئے ان کی حکومت کو ختم کیا گیا اور قومی اسمبلی، سینیٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کو بیک جنبش قلم تحلیل کر دیا گیا اور ۱۹۷۳ء کے دستور کو عملاً غیر مؤثر کر کے ملک میں ازسرِنو مارشل لا کے ذریعے اقتدار پر غاصبانہ قبضے کو یقینی بنایا گیا۔ اس اقدام کا گرینڈ نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (GDA)، پاکستان پیپلز پارٹی، تحریک انصاف اور ایم کیو ایم کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور نواز شریف حکومت کے خاتمے کو درست اقدام قرار دیا۔ جماعت اسلامی غالباً وہ واحد دینی اور سیاسی جماعت ہے جس کی طرف سے اس فوجی اقدام کی دوٹوک مخالفت کی گئی۔ جمہوری نظام کو معطل کرنے کی مذمت کی گئی اور ملک میں فوری طور پر جمہوریت بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

ملک کے صدر جناب رفیق تارڑ نے جو آئینی سربراہ حکومت تھے جنرل پرویز مشرف کے اس اقدام کے بعد ایوان صدر کے اندر ٹھیرنا منظور کیا اور اس عرصے میں فوجی ڈکٹیٹرشپ جو اقدام کرتی رہی اس پر ایوان صدر سے نہ کوئی سرزنش کی گئی، نہ کوئی احتجاج کیا گیا اور نہ کوئی ڈائریکشن دی

گئی۔ عملاً ڈیڑھ سال تک وہ ایوان صدر میں رہے۔ ڈیڑھ سال کے بعد جنرل مشرف نے انھیں بھی توہین آمیز طریقے سے رخصت کیا اور چیف ایگزیکٹو کے عہدے کے ساتھ ساتھ صدارت کے عہدے پر بھی قابض ہوئے۔ ملک میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے جمہوری، سیاسی اور آئینی اداروں کی شکست وریخت کا جو عمل شروع ہوا تھا اس اقدام کے بعد وہ اپنے منطقی اور انتہائی انجام کو پہنچ گیا۔

اس عرصے میں مسلم لیگ (ن) کی قیادت نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا کہ فوجی اقدام کو غلط قرار دیا جائے اور آئین کے مطابق ان کی حکومت کو بحال کرتے ہوئے ملک میں آئین کو غیر مؤثر کرنے کے اقدام کو غلط قرار دیا جائے۔ ظفرعلی شاہ کیس میں سپریم کورٹ کے بنچ نے عملاً اس چیز کو رد کیا اور بعض تحفظات کے ساتھ فوجی اقدام کے اس عمل کی توثیق کردی۔ ریفرنڈم کے موقع پر امیر جماعت اسلامی پاکستان محترم قاضی حسین احمد نے ریفرنڈم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ سپریم کورٹ کے بنچ نے اس وقت بھی یہ قرار دیا کہ پی سی او کے تحت ریفرنڈم منعقد کیا جاسکتا ہے۔ عملاً ان فیصلوں کے بعد پرویز مشرف کی داخلہ وخارجہ اور نظریاتی محاذوں پر پالیسی ۱۸۰ درجے کے انحراف کے ساتھ آگے بڑھی۔

اس دوران ۷ا جون ۲۰۰۱ء کو متحدہ مجلس عمل وجود میں آئی۔ چھے دینی جماعتوں کے سربراہ اسلام آباد میں جمع ہوئے۔ افغانستان کے حالات کے تناظر میں فوجی ڈکٹیٹرشپ اور لادینیت کے حوالے سے رہنما اصولوں پر مبنی ایک چارٹر پر اتفاق کیا گیا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ متحدہ مجلس عمل کی صورت میں دینی وسیاسی جماعتوں کا انتخابی اتحاد وجود میں آیا۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ یہ مختلف مسالک رکھنے والے لوگ' جلد ہی باہم ٹکرائیں گے اور یہ اتحاد تحلیل ہوجائے گا اور اپنا وجود کھودے گا۔ لیکن مجلس عمل نے اپنی تنظیم سازی، ٹکٹوں کی تقسیم، حکومت سازی' پارلیمنٹ میں کارکردگی اور بین الاقوامی مسائل پر مشترکہ لائحہ عمل اختیار کر کے ان سارے مفروضوں کو ناکام بنادیا۔ مجلس عمل کی قیادت نے حالات کا ادراک کرتے ہوئے بڑے سلیقے کے ساتھ نئے چیلنجوں کے مقابلے میں قوم کو دینی بنیادوں پر متحد کیا۔

مجلس عمل کو عملاً کئی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ سرحد کے بلدیاتی انتخابات میں مجلس عمل کو دھچکا لگا لیکن اس شر سے یہ خیر برآمد ہوا اور سب کو آگاہی ہوئی کہ اتحاد میں ہی عزت اور وقار ہے

اور یقیناً یہ اتحاد مستقبل میں بھی ملک وقوم کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ انتخابات میں صوبائی ممبران کا انحراف بھی مجلس عمل کی قیادت کے لیے مشکلات کا باعث بنا ہے لیکن اسی صوبے میں اے این پی، پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) کے ممبران اسی دولت کی دہلیز پر ڈھیر ہوگئے۔ لیکن اخباری پروپیگنڈے کے حوالے سے 'بڑی' کسی پارٹی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس کی تحقیق کرے اور یہ متعین کرے کہ ان کے کتنے اور کون کون ارکان صوبائی اسمبلی آتش زر کی حدت سے پگھل کر مرکزی اقتدار کے ساتھ بہہ گئے ہیں۔ مجلس عمل کی قیادت اور پالیسی ساز ادارے نے اپنے ہی ممبران کے خلاف تادیبی کارروائی کر کے عملاً سیاست کے میدان میں نیا کلچر متعارف کروایا ہے۔

اس عرصے میں فوجی ڈکٹیٹرشپ تمام غیر جمہوری اور غیر اخلاقی اقدامات کرتی رہی۔ ایم ایم اے نے حکومتی چالوں اور عیارانہ رویے پر احتجاج کیا۔ پاکستان کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں نے سیاسی نظام کے ایکٹ کی ترمیم اور بلدیاتی انتخابات اور منتقلی اقتدار کے تحت انتخابات کے ان مراحل کو' پھر عام انتخابات کے بعد اور اس سے پہلے ایل ایف او کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔ کسی دوسری جماعت نے بھی ایل ایف او کے تحت انتخابات کے کسی مرحلے میں سیاسی پیش بندی سے اجتناب نہیں کیا۔ اس کی بنیادی روح یہی تھی اور سیاسی و دینی جماعتیں اس پر متفق تھیں کہ جب پبلک میں بظاہر مقبول جماعتوں نے فوجی ڈکٹیٹرشپ کے کسی اقدام کو چیلنج نہیں کیا، اس ڈکٹیٹرشپ سے چھٹکارے کا راستہ، انتخابات' مکالمہ اور پارلیمنٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ پھر ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو انتخابات ہوئے اور آئینی ترامیم کے ساتھ سیٹوں میں اضافہ ہوا۔ اس سے قبل قومی اسمبلی ۲۱۷ ارکان پر مشتمل تھی لیکن ترامیم کے بعد یہ تعداد ۳۴۲ کردی گئی۔ ۲۷۲ عام نشستیں، خواتین کی ۶۰ نشستیں، اقلیتوں کے لیے ۱۰ نشستیں اور اس طرح ۳۴۲ کے ایوان کی ہیئت ترکیبی طے پائی۔ سینیٹ کی سیٹوں میں بھی اضافہ کر کے اس کی نشستوں کی تعداد ۱۰۰ کردی گئی۔ عام نشستیں ۵۶، خواتین ۱۰، اسلام آباد ۴، فاٹا ۸ نشستیں، اس طرح سینیٹ کی کل ۱۰۰ نشستیں کردی گئیں اور یہ تمام صوبوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر نشستیں ہیں۔

مجلس عمل نے سرحد اور بلوچستان میں کتاب کے نشان کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا۔ پنجاب میں اسٹیبلشمنٹ اور فوجی ڈکٹیٹرشپ کا غلبہ تھا۔ یہاں کوشش کی گئی کہ اپوزیشن جماعتوں سے

ایڈجسٹمنٹ کی جائے تاکہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کا مقابلہ کیا جاسکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن) کے درمیان انتخابی عمل طے نہ پاسکا۔ مجلس عمل اور مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف کے درمیان نیم دلی کے ساتھ تاخیر سے ایڈجسٹمنٹ ہوئی لیکن عملاً نتائج پر اس کا کوئی بہت بڑا اثر نہیں پڑا۔ ان انتخابات میں جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کے مطابق قومی اسمبلی میں جنرل نشستوں پر ہمارے ۴۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اسلام آباد سے ایک، فاٹا سے ۷، خواتین ۱۲ اور اقلیتوں میں ایک مرد اور ایک خاتون۔ اس طرح عملاً ہمارے ۶۵ ارکان منتخب ہوئے۔ ایک ممبر جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا اوّل روز سے ہی منحرف ہوگئے اور ایک اور ممبر جن کا تعلق جمعیت علماے اسلام سے تھا وہ بھی مجلس عمل کے فیصلوں سے عملاً پہلو تہی کرنے لگے۔ اس طرح سینیٹ میں پنجاب سے ایک، سندھ سے ایک، سرحد سے ۱۰، بلوچستان سے ۶، فاٹا سے ۴ نشستیں ملیں۔ اب اس وقت سینیٹ کے اندر ہمارے ۲۶ ارکان موجود ہیں۔ بلوچستان اسمبلی میں مجلس عمل کے ممبران ۱۸ ہیں۔ پنجاب میں ۱۱ منتخب ہوئے۔ ایک رکن کا انتقال ہوگیا اور ایک صاحب راولپنڈی سے انحراف کر گئے۔ سندھ سے ہمارے ۱۰ ممبران منتخب ہوئے، ان میں سے دو انحراف کر گئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق اسلامی تحریک اور ایک کا جمعیت علماے اسلام (ف) سے ہے۔ سرحد سے ۶۸ ارکان اسمبلی منتخب ہوئے۔

مرکزی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے لیے ہمارا مطالبہ تھا کہ ایک نشان پر سب سے بڑا گروپ مجلس عمل کا ہے۔ اس کا حق بنتا ہے کہ اپوزیشن لیڈر کے لیے مجلس عمل کو ترجیح دی جائے۔ بالآخر ۲۵ مئی ۲۰۰۴ء کو محترم مولانا فضل الرحمٰن کو بحیثیت اپوزیشن لیڈر تسلیم کرلیا گیا۔ اسی طرح سینیٹ میں پہلے مرحلے میں مجلس عمل کے ۲۱ ارکان موجود تھے۔ حکمران گروپ کے بعد ایک بڑے گروپ کی حیثیت سے مجلس عمل کا حق تھا کہ سینیٹ میں بھی اپوزیشن لیڈر ہمارا ہو جس کے لیے طے بھی پایا کہ محترم پروفیسر خورشید احمد سینیٹ میں اپوزیشن لیڈر ہوں گے اور محترم مولانا گل نصیب مجلس عمل کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر ہوں گے۔ مگر حکومت نے پیپلز پارٹی کے میاں رضا ربانی کو یک طرفہ طور پر اپوزیشن لیڈر بنانے کا اعلان کردیا۔ ہم نے اپوزیشن کے اتحاد کے لیے اس کو برداشت کیا کہ اپوزیشن جماعتوں میں اختلاف نہیں بڑھنا چاہیے حالانکہ مرکزی سپریم کونسل کے فیصلے کے مطابق سینیٹ میں ۲۲ ارکان کے ساتھ اپوزیشن لیڈر کے لیے ہمارا حق بنتا ہے۔

ان چار سالوں میں قومی اسمبلی میں ہم نے ۱۲۷۳ سوالات ، بین الاقوامی موضوعات پر ۵۱۷ تحاریک التوا، عوامی مسائل پر ۱۲۳۱ توجہ دلاؤ نوٹس، ۲ہزار ۷ سو ۳۱ قرار دادیں جو عوامی قومی اور بین الاقوامی مسائل سے متعلق تھیں، نیز ۱۲۵ تحاریک استحقاق پیش کیں۔ ایک تحریک جو ۲۴۱ کہلاتی ہے، جس پر بحث ہوئی و دیگر ۲۹۱ نوٹس۔ اس طرح رول ۶۹ جس کے تحت اہم ایشو پر آٹھ گھنٹے کی بحث ہوسکتی ہے، بجٹ کی بحث میں ۶۹ نوٹس، ۱۵۲ کٹوتی کی تحریکیں پیش کیں۔ اسی طرح سینیٹ میں ۲ہزار ۲ سو ۵۷ سوالات، ۱۸۶ تحاریک التوا، ۳۳۵ توجہ دلاؤ نوٹس، ایک ہزار ۹ سو ۱۱ قرار دادیں اور ۱۵ تحاریکِ استحقاق جمع کرائیں۔ ہمارا ایک باقاعدہ پارلیمانی دفتر ہے جس میں ہمارے ساتھی بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس سارے کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے ممبران اور خاص طور پر خواتین ممبران نے اپنے منفرد تشخص، وقار اور عرق ریزی کے ساتھ قومی ایشوز پر نہ صرف بروقت گرفت کی بلکہ دعوتی و تنظیمی اعتبار سے بھی اپنے کردار کو مؤثر اور جان دار انداز میں پیش کیا۔

منتخب اداروں میں قانون سازی اہم ترین موضوع ہے۔ ہم نے قومی اسمبلی میں ۳۴ نئے بل جمع کرائے اور اس وقت تک ۳۶ بل زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان میں سے ۱۰ کی پہلی خواندگی اور ترامیم کے نتیجے میں حتمی بحث میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اس طرح فنانس بل ۰۴-۲۰۰۳ء، ۰۵-۲۰۰۴ء اور ۰۶-۲۰۰۵ء کی بجٹ ، عام بحث میں حصہ لیا اور ترامیم بھی جمع کرائیں۔ اسی طرح جتنی بھی مجالس قائمہ موجود ہیں ان میں ہماری سرگرم اور بیدار نمایندگی موجود ہے۔

۳۴ نئے بل ہم نے اسمبلی سیکرٹریٹ میں دیے۔ اس میں سنگین غداری' انڈسٹریل ریلیشنز آرڈی ننس جو این ایل ایف کے تعاون سے تیار کیا گیا' آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ کی تنسیخ کا بل اور آرمی ایکٹ میں ترامیم شامل ہیں۔ اسی طرح قرآن کی طباعت' قومی سلامتی' دستور میں ترمیم یا جہیز یا شادی کے تحائف سے متعلق، مختلف عوامی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی ایشو، پر مجوزہ مسودہ ہاے قانون (bill) پیش کیے۔

آئین کے مطابق صدر کی یہ ذمہ داری ہے کہ پارلیمنٹ کے ہر پارلیمانی سال کے آغاز پر خطاب کریں۔ انھوں نے ایک سال خطاب کیا ہے' مزید پارلیمانی سال ایسے گزرے ہیں کہ وہ اس سے خطاب نہیں کرسکے ہیں۔ صدارتی ویب سائٹس پر سوال کا جواب دیتے ہوئے جنرل پرویز

مشرف نے کہا کہ یہ غیر مہذب پارلیمنٹ ہے۔ میں اس سے خطاب نہیں کرنا چاہتا۔ ان میں خوف اور بزدلی ہے۔ وہ اداروں کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر وہ خطاب کی جرأت نہیں کرسکے۔ اسی طرح داخلہ وخارجہ اور مالیاتی امور میں یا پالیسی سازی میں کابینہ یا پارلیمانی پارٹی کو کوئی اختیار نہیں۔ اس کے فیصلے فردِ واحد کے ہاتھ میں ہیں یا کور کمانڈرز کی سطح پر کیے جاتے ہیں۔ عملاً پارلیمنٹ کو غیر مؤثر بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔

کراچی کے حالات، فاٹا، بلوچستان، ریلوے کے حادثات، تخریب کاری، امن عامہ کے مسائل اور زراعت کے مسائل پر تحریکیں بھی دیں اور اس پر بحث بھی کی۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ، بے روزگاری، جرائم میں اضافہ، ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا حیاسوز اور فحش مناظر کی بہتات کے خلاف، چینی اور سیمنٹ کے بحران پر قراردادیں پیش کیں، احتجاج بھی کیا ہے۔ مغرب میں چھپنے والے توہین آمیز خاکوں کے خلاف سب سے پہلے نومبر ۲۰۰۵ء میں قومی اسمبلی میں ہم نے تحریک پیش کی اور اس مسئلے کو اٹھایا لیکن اس کے بعد حکومت نے کوئی اقدام نہ کیا۔ پاک فضائیہ میں، پی آئی اے میں افسران اور بطور سٹیورڈ افسران کے لیے داڑھی منڈانے کے احکامات، یا ائیر ہوسٹس کے لیے ایک عمر کی حد کے بعد برطرفی اور دوپٹے کے معاملے پر بھی ایوانوں میں احتجاج بھی کیا اور مؤثر آواز اٹھائی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان چار سالوں میں قومی اسمبلی اور سینیٹ اراکین اور چاروں اسمبلی کے ممبران کی تمام کوششوں اور تیاریوں کے باوجود جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا اور ملک اور قوم کی توقعات پوری نہ ہوسکیں۔ سال ۲۰۰۳ء بہت اہمیت کا سال تھا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس اور ایل ایف او پر احتجاج ہوا جو ۲۴ دسمبر ۲۰۰۵ء تک جاری رہا۔ پھر مذاکرات کا ڈول ڈالا گیا۔ مجلس عمل اور پیپلز پارٹی کے ساتھ مذاکرات ہوئے۔ مجلس عمل کو پیش کش تھی کہ وہ ڈپٹی پرائم منسٹر شپ، ڈپٹی اسپیکر شپ اور وزارتوں میں حصہ لے لیکن مجلس عمل کے ساتھ حکومتی مذاکرات اس لیے ختم ہوگئے کہ ہم نے ایل ایف او کو پارلیمنٹ میں یا آئینی ترامیم کو یا صدارت کو یا ریفرنڈم کی بنیاد پر سپریم کورٹ کی توثیق کو قبول نہ کیا۔ حکومت سازی کے لیے ہمارے مذاکرات ختم ہوئے تو پیپلز پارٹی سے حکومت میں حصہ لینے کے تمام مراحل طے پائے۔ مخدوم امین فہیم کو عملاً پرائم منسٹر کے طور پر پروٹوکول

ملنا شروع ہوگیا۔ ان کے مذاکرات ایل ایف او یا جمہوریت کی بنیاد پر نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے مقدمات کی واپسی میں ناکامی کے باعث ختم ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مخدوم امین فہیم کے حلف سے پہلے مقدمات واپس ہوں لیکن فوجی ڈکٹیٹرشپ چاہتی تھی کہ وہ پہلے حکومت کا حصہ بنیں اور اس کے بعد مقدمات واپس ہوں۔

تمام اپوزیشن جماعتوں نے آئینی امور پر مذاکرات میں حصہ لیا ہے۔ مذاکرات میں ایل ایف او کے وہ ۲۹ بنیادی نکات تھے جن کے ذریعے آئین کی ترامیم کا اقدام کیا گیا تھا۔ تمام اپوزیشن جماعتوں نے ۲۲ نکات پر اتفاق کیا۔ سات اختلافی نکات تھے۔ اے آر ڈی کی تجویز پر آٹھویں آئینی ترمیم کے طرز پر سترھویں آئینی ترمیم حکومت نے طے کی اور اسی طرح جب سترھویں آئینی ترمیم کا بل تیار ہو کے آیا تو اے آر ڈی، مجلس عمل اور حکمران جماعتوں نے دوشقوں کے علاوہ سترھویں آئینی ترمیم پر مکمل بحث اور حصہ لے کے اپنا کردار ادا کیا لیکن اس پر بعد میں تنقید ہوئی کہ یہ دراصل حکومت کا جال اور بدنیتی تھی۔ اپوزیشن جماعتیں سیکولر شناخت کے ساتھ حکومتی جال کا حصہ بنیں، جب کہ مجلس عمل اور دین کی آواز کو زک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ درحقیقت مجلس عمل نے ان بنیادوں پر اس چیز کو طے کیا کہ فردِ واحد کو اس کا حق حاصل نہیں۔ سپریم کورٹ کی طرف سے سند جواز ملنے کے بعد حکومت از خود آئین میں ترمیم کا حق نہیں رکھتی۔ دو تہائی اکثریت اس کی بنیاد ہے۔ اس طرح ریفرنڈم کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کو محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ محفوظ نہیں رہتا تو پارلیمنٹ کی جگہ صدارتی نظام آنے کی صورت میں پاکستان کا وجود خطرے میں پڑسکتا ہے۔

اس وقت مجلس عمل نے جو معاہدہ کیا اس کے مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو جنرل پرویز مشرف کو صدارت سے فوجی عہدہ الگ کرنا چاہیے تھا۔ یہ معاہدے کی اصل روح تھی۔ ایس ایم ظفر کی کتاب Dialogue on the Political Chessboard (سیاسی شطرنج کی تختی پر مکالمہ) میں اس کی مکمل تفصیل موجود ہے۔ اس آئینی ترمیم کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایل ایف او اسی طرح اس قوم کی گردن پر مسلط ہے۔ اپوزیشن جماعتوں نے اس چیز پر اتفاق کیا ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو آئین جس شکل میں تھا اس کی بحالی کی جدوجہد کی جائے۔ سترھویں ترمیم کا مخمصہ ختم ہونا چاہیے۔ جنرل پرویز مشرف کے دور اقتدار میں اس اسمبلی کے وجود میں آنے سے پہلے ۱۳۷ قوانین اور

آرڈر جاری کیے گئے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ۱۹۵۴ء میں آئین بنا پھر ۵۶ء میں بنا اور پھر ۱۹۷۳ء میں دستور بنا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں دو تین فیصلے موجود ہیں۔ ٹرانسفر آف پاور کے یہ تمام مراحل موجود ہیں۔ ایک حکومت کے خاتمے کے بعد ملک میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا۔ نئی یا عارضی حکومت جو اقدامات کرتی ہے' کوئی مانے یا نہ مانے اس کی اپنی ایک حقیقت اور حیثیت موجود رہتی ہے۔ پھر اب تک بننے والے تمام آئینی اور انتظامی اقدامات کو کسی تعزیر یا قانونی چارہ جوئی سے جو برأت وتحفظ (indemnity) دیا گیا' اس کو آئینی ترمیم نہیں بلکہ سادہ اکثریت کے ساتھ کسی وقت بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس نظام کی تبدیلی کے لیے یہ ساری جدوجہد آگے بڑھ رہی تھی' جنرل پرویز مشرف اپنی انا اور ڈکٹیٹرشپ کو قائم رکھنے کے لیے سول بیوروکریسی اور ملک کے اقتدار پر اپنی گرفت ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے اپوزیشن جماعتوں کے پاس تحریک اور جدوجہد کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

پرویز مشرف کی موجودگی میں نئے انتخابات کا شفاف اور غیر جانب دارانہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس پر اتفاق کیا گیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف مستعفی ہوں۔ سیاسی جماعتیں اپنے طرزِعمل سے سبق سیکھیں اور کسی ڈکٹیٹر جنرل کو ریلیف دینے کے بجاے جمہوریت کو ترجیح دیں۔ سیاسی جماعتوں نے اس پر بھی اتفاق کیا ہے کہ وفاقی پارلیمانی نظام ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق ہو اور صوبوں کو اپنی انتظامی حدود کے اندر مکمل ضروری اختیارات دیے جائیں۔ آئین کے مطابق موجودہ حکومت اور صدر مستعفی ہوں اور عبوری حکومت قائم ہو۔ اگلے الیکشن ایک بااختیار الیکشن کمیشن کی تشکیل کے بعد منعقد ہوں۔

ان چار سالوں میں ہم نے اپنی حد تک کوشش کی کہ باقاعدہ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس کریں۔ تمام ایشوز پر اتفاق راے پیدا کریں اور کوئی بھی ایسا ایشو نہیں ہے جس کو پارلیمانی پارٹی میں زیربحث نہ لایا گیا ہو۔ مجلس عمل اور اس میں جماعت اسلامی کی تنظیم نے یہ کردار ادا کیا کہ اتحاد کو بھی قائم رکھا جائے اور جو قومی' بین الاقوامی اور عوامی ایشوز ہیں' ان میں بھی اپنا کردار ادا کیا جائے۔ پاکستان کی اسلامی ثقافت' دوقومی نظریے' مسجد اور مدرسے پر جو سیکولر یلغار ہے اس کے مقابلے کے لیے ہم نے مسلسل کوشش بھی کی ہے اور ایشوز کو زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار بھی ادا کیا ہے۔

بانیانِ پاکستان کا تصورِ تعلیم: ایک تاریخی حوالہ

سلیم منصور خالد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی دور کی مشکلات اور پریشان کن حالات کے باوجود' نوزائیدہ مملکت میں جو سب سے پہلی قومی کانفرنس منعقد ہوئی' وہ پاکستان کے نظامِ تعلیم کے بارے میں تھی۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تعلیم کی تشکیلِ نو کا مسئلہ ابتدائی اور کس قدر اہم تھا۔ یہ کانفرنس ۲۷ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء تک کراچی میں منعقد ہوئی' یعنی قیامِ پاکستان کے صرف دو ماہ اور ۱۳ دن بعد۔ قائداعظمؒ بیماری کے باعث شریک نہ ہو سکے' مگر کانفرنس کی اہمیت کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے پیغام کے ذریعے شرکت کی اور مرکزی وزیر تعلیم کو جو ہدایات دیں' وہ کلیدی خطاب میں قوم کے سامنے آئیں۔

کانفرنس کے چیئرمین جناب فضل الرحمٰن مرکزی وزیر داخلہ' اطلاعات ونشریات اور تعلیم تھے' جب کہ ۵۷ شرکاے کانفرنس میں متعدد ارکان دستور ساز اسمبلی اور چوٹی کے ماہرین تعلیم شامل تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اور اب ایک نئے وطن' پاکستان کی تشکیل کا فریضہ انجام دینے چلے تھے۔ انھیں قوم سے کیے گئے اپنے وعدے بھی یاد تھے اور قوم کی منزل کے نقوش بھی ان کے سامنے روشن تھے۔ ان شرکا میں وطن عزیز میں بسنے والے دیگر مذاہب یعنی عیسائیوں اور ہندوؤں کے قابلِ احترام نمایندے بھی شریک تھے۔

اس پانچ روزہ پاکستان تعلیمی کانفرنس کی روداد (proceedings) مرکزی وزارت داخلہ (شعبہ تعلیم) نے شائع کی' جو ۹۱ صفحات پر مشتمل نہایت اعلیٰ درجے کی دستاویز ہے۔ قائداعظم

محمد علی جناح نے نہ صرف اس دستاویز[1] کا مطالعہ کیا، بلکہ اسے سراہا بھی۔ اس کانفرنس کی روداد میں پاکستان کے مستقبل، یعنی پاکستان کی نسلِ نو کو درست سمت عطا کرنے کا جذبہ اور شعور، گہرے ادراک کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ لازم ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ، بالخصوص فوج، سیاست دان، بیوروکریسی، تعلیم اور قانون سازی کے متعلقین، بانیان پاکستان اور تحریک پاکستان کے سنجیدہ وفہیدہ قائدین کے اس تعلیمی وصیت نامے کو پڑھیں۔ چونکہ آج کل بالخصوص امریکی صدر بش نے، مسلم دنیا کے نظام تعلیم کو اپنا مرکزی ہدف قرار دے رکھا ہے۔ اس لیے کئی مسلم ممالک میں ان کے حلیف حکمران ان کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے ملک کے نظام تعلیم پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور سرکاری اداروں یا وہاں سرگرمِ کار، مخصوص این جی اوز کو ہر طرح کی مدد بہم پہنچا رہے ہیں۔

پاکستان کی تخلیق کسی فوجی جرنیل کے دماغ کی اختراع نہیں تھی۔ قانون، جمہور اور راے عامہ کے ملاپ اور ایمانی جذبے نے اس تصور کو ایک زندہ ریاست کا روپ عطا کیا تھا۔ اس لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ لوگ پاکستان میں کیسا نظام تعلیم چاہتے تھے۔ زیرمطالعہ قومی تعلیمی روداد میں، سائنسی ترقی وتحقیقات پر شدت سے اصرار کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ، تحریک پاکستان کی لازوال روح کو بھی پوری دل سوزی سے نظام تعلیم میں سمو دینے کا بھرپور اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے بعد معزز شرکا نے مختلف کمیٹیوں کی شکل میں، اپنے اپنے دائرے میں تجاویز دیں اور حکمت عملی تجویز کی، جسے آخری روز مکمل اجلاس میں شق وار منظور کیا گیا ہے۔ روداد میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا کہ کمیٹی کی سفارشات کو مکمل طور پر ریکارڈ پر لایا جائے۔ پھر مکمل اجلاس نے جس لفظ کو حذف کیا یا جس لفظ کا اضافہ کیا، اسے بھی دستاویز کا حصہ قرار دیا گیا تاکہ حک واضافہ اور ناسخ ومنسوخ دونوں نگاہ میں رہیں۔ کیسے محتاط لوگ تھے!

اس کانفرنس کی تین کمیٹیوں کی متفقہ سفارشات اور تین قراردادیں ملاحظہ کیجیے:

- سب سے پہلے 'یونی ورسٹی ایجوکیشن کمیٹی' کی تشکیل اور نظریاتی سوچ دیکھتے ہیں: کمیٹی

1- *Proceedings of The Pakistan Educational Conference*, Karachi, November 27 to December 1st 1947. Government of Pakistan, Ministry of the Interior, Education Division, Karachi [January 1948]

کے چیئرمین میاں افضل حسین (چیئرمین پبلک سروس کمیشن پنجاب و سرحد) تھے اور سیکریٹری ڈاکٹر اختر حسین، ایجوکیشن ایڈوائزر، جب کہ ارکان تھے: ۱- ڈاکٹر محمود حسین، وائس چانسلر ڈھاکہ یونی ورسٹی ۲- ڈاکٹر عمر حیات ملک، وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی ۳- ڈاکٹر اے بی اے حلیم، وائس چانسلر سندھ یونی ورسٹی ۴- ڈاکٹر سی ایچ رائس، پرنسپل ایف سی کالج، لاہور ۵- ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ممبر دستور ساز اسمبلی ۶- پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور ۷- دیوان بہادر سنگھا، اسپیکر مغربی پنجاب صوبائی اسمبلی، لاہور ۸- ڈاکٹر کرنل اے کے ایم خان، پرنسپل ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی۔

اس کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا:

- پاکستان کا تعلیمی نظام، اسلامی نظریے کی بنیاد پر مرتب کیا جائے گا۔
- مسلمان طالب علموں کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں دینی تدریس لازمی ہوگی، اور یہی سہولت دیگر مذاہب کے حاملین کو بھی فراہم کی جائے گی۔
- تمام سطحوں پر جسمانی تربیت لازمی دی جائے گی، جب کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں لازمی فوجی تربیت دی جائے گی۔ (پروسیڈنگز: دی پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ص ۱۸)

● دوسری رپورٹ ہے، کمیٹی برائے پرائمری اور ثانوی تعلیم کی۔ اس کمیٹی کے چیئرمین ڈھاکہ کے ابونصر وحید تھے اور سیکریٹری محمد عبدالقیوم ایجوکیشن آفیسر، جب کہ ارکان میں شامل تھے: ۱- ایس ایم شریف، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، صوبہ پنجاب ۲- ڈاکٹر قدرتِ خدا، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، مشرقی پاکستان ۳- ڈاکٹر داؤد پوتا، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، صوبہ سندھ ۴- محمد اسلم خان خٹک، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، صوبہ سرحد ۵- ایم اے مجید، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، ریاست بہاول پور ۶- وی یو پروانی، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، ریاست خیرپور ۷- آئی ایم خان، سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن، بلوچستان ۸- شایستہ اکرام اللہ ۹- پروفیسر بی اے ہاشمی، پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور ۱۰- جی ڈی برنی، بشپ آف لاہور ۱۱- بیگم صفیہ احمد۔

اس کمیٹی نے نظریہ تعلیم کے لیے حسب ذیل رہنما اصولوں کی منظوری دی:

۱- تعلیم، اسلامی نظریہ آفاقی اخوت، سماجی جمہوریت، اور سماجی عدل و انصاف کی ترویج پر مبنی ہوگی۔

۲- طالب علموں کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنے مذاہب کے بنیادی اصولوں کو پڑھیں۔
۳- تعلیم روحانی، سماجی اور فنی امتزاج پر استوار ہوگی۔ (روداد، ص ۲۱)

● ویمن ایجوکیشن کمیٹی کی چیئرپرسن، بیگم سیدہ فاطمہ رحمٰن اور سیکریٹری ڈاکٹر سید مزمل علی تھے۔ ارکان میں شامل تھے: ۱- ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین، ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن، پنجاب ۲-مس محمد علی، انسپکٹریس اسکولز، سندھ ۳- بیگم سلمیٰ تصدق حسین ۴- بیگم صفیہ احمد ۵- بیگم شایستہ اکرام اللہ خان ۶- ڈاکٹر قدرت خدا ۷- ایس ایم شریف ۸- پروفیسر بی اے ہاشمی۔

کمیٹی نے خواتین کی تعلیم کے لیے مختلف پہلوؤں پر سفارشات پیش کرتے ہوئے کہا:

- تعلیم کی نظریاتی بنیادوں میں: اسلام کے آفاقی تصورِ اخوت و بھائی چارے، سماجی جمہوریت، سماجی عدل وانصاف اور جمہوری قدروں کی ترویج ہوگی جس میں برداشت، خودانحصاری، ذاتی ایثار، انسانی ہمدردی اور شہری اشتراک کو ترقی دی جائے گی، جب کہ صوبائی تعصبات کی نفی کی جائے گی۔
- ثانوی درجہ تعلیم میں لڑکیوں کے لیے جداگانہ تدریس کا بندوبست کیا جائے، اور جلد از جلد لڑکیوں کے لیے الگ کالج بنائے جائیں۔
- ہوم نرسنگ کی تعلیم پر مبنی نصاب کی تدریس لازمی کی جائے۔ ابتدائی طبی امداد اور ہوم نرسنگ، اعلیٰ ثانوی درجہ تعلیم میں بھی لازمی کی جائے۔
- مغربی اور مشرقی پاکستان میں خواتین کے لیے فی الفور ایک ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے۔ (روداد، ص ۲۴، ۲۵)

ان سفارشات میں نظریاتی تعلیم کی اہمیت کے ساتھ، طالبات کے لیے جداگانہ نصاب کی ضرورت اور مخلوط تعلیم کی نفی قابلِ غور ہے۔

بعدازاں دیگر شعبہ جات جن میں سائنس وٹکنالوجی، زراعت، تعلیمِ بالغاں، مظلوم طبقات، اقوام کے مابین ثقافتی تعلقات وغیرہ پر مشتمل کمیٹیوں کی رپورٹیں بھی منظور ہوئیں۔ یونی ورسٹی ایجوکیشن، ویمن ایجوکیشن اور اسکول ایجوکیشن کمیٹیوں کے مشترکہ اجلاس نے پانچ قراردادیں منظور کیں، جن میں پہلی چار قراردادیں پیش مطالعہ ہیں:

۱- کانفرنس اس امر پر زور دیتی ہے کہ پاکستان کی تعلیمی سرگرمیوں کو اس کے قومی کردار کا مظہر ہونا چاہیے' اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلام کے تصورِ انسانیت کو روبہ عمل لایا جائے اور نسلی و جغرافیائی عصبیتوں سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کی جائے۔ کانفرنس نے اکثریت کے اس عزم کو قبول کیا ہے کہ اس کا نظامِ تعلیم اسلامی تعلیمات سے فیض یاب ہو' تاہم اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیتوں کو ان اصولوں کے تحت تعلیم دی جائے جو انسانیت کے لیے اسلام کے ترقی پسندانہ اور معیاری نشان کے مظہر ہیں۔ عزت مآب جوگندر ناتھ منڈل [وزیر قانون و محنت] اور مسٹر سی ای گبن [صدر اینگلو انڈین ایسوسی ایشن آف پاکستان] اس حوالے سے کانفرنس کمیٹی کی پیش کردہ سفارشات سے پوری طرح متفق ہیں۔ اس لیے یہ امر متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم' اسلامی نظریے ہی کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے کہ جس میں آفاقی بھائی چارے' تحمل اور عدل کے امتیازی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ (روداد' ص ۴۰)

۲- کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ جدید طرزِ زندگی (ماڈرن لائف) کی بہت سی سماجی آفت انگیزیوں کا سبب روحانی اور اخلاقی اقدار کی نفی ہے۔ اس حوالے سے جان لینا چاہیے کہ سماجی تعمیرنو کا کوئی پروگرام اُس وقت تک حصولِ مقصد کا ذریعہ نہیں بن سکتا جب تک کہ انسانی روح کے اس خلا کو پر نہیں کیا جاتا۔ کانفرنس یہ پہلو نمایاں کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ بہت سے مغربی ممالک' جہاں جدید تعلیمی نظریات نافذ ہیں' اب وہ بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ اسکولوں کے نصابات میں دینی تعلیم کا لازمی طور پر نفوذ ہونا چاہیے اور جسے کالج کی سطح پر معتدبہ طور پر بڑھانا چاہیے۔ کانفرنس کی سفارشات میں اس حوالے سے مسلم اکثریت کی خواہش کا عکس موجود ہے' تاہم اقلیتوں کی ثقافتی خودمختاری کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس امر کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ' جس طرح مسلمان طالب علموں کے لیے دینی تعلیم لازمی ہو' ویسے ہی اقلیتیں اگر خواہش کریں تو ان کے بچوں کے لیے بھی ان کے مذاہب کے مطابق تعلیم وتدریس کا اہتمام کیا جائے۔ (روداد' ص ۴۰'۴۱)

۳- کانفرنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم کو ٹوٹ پھوٹ کے اس عمل سے مقابلہ

کرنا چاہیے، جس نے جدید دنیا (ماڈرن ورلڈ) میں فرد کی شخصیت کو انتشار کا شکار کر کے رکھ دیا ہے۔ لازمی طور پر ایک متوازن نظامِ تعلیم ہی ایسے پارہ پارہ تصورِ تعلیم کا مداوا کر سکتا ہے۔ اس لیے خاکہ نصاب (کریکولا) اور مقررہ نصاب (سلیبس) کی اس انداز سے تشکیل و پشت پناہی کی جانی چاہیے کہ جس سے تعلیم کے مختلف عناصر باہم متحد اور یک جان ہو سکیں۔ (روداد، ص ۴۱)

۴- کانفرنس تسلیم کرتی ہے کہ روحانی، ذہنی اور جسمانی پہلو لازمی طور پر طالب علم کی زندگی میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم محض کمرہ تدریس اور مطالعۂ کتاب پر زور دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک عام سا طالب علم اپنی صحت کے بارے میں غفلت کا شکار ہو کر بیماری اور کمزوری کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ جدید تعلیم کا بڑا ہدف ایک اچھے شہری کی تعمیر ہے، اور صحت کے بارے میں غفلت کا شکار ہونے والا فرد اچھا شہری نہیں بن سکتا۔ اس مقصد کے لیے جسمانی تربیت کے کلچر کو عام کیا جائے، بالغ طالب علموں کو اپنے وطن عزیز کی آزادی کے تحفظ کے لیے لازمی فوجی تربیت دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اہتمام کیا جائے کہ اسکاؤٹنگ، ملٹری ڈرل، رائفل کلب، کوہ پیمائی، پیراکی وغیرہ کو تعلیمی دنیا میں رواج ملے، جب کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی سطح پر لازمی فوجی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ (روداد، ص ۴۱)

نصف صدی بعد، ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں بانیانِ پاکستان کے متذکرہ بالا محسوسات اور ان کی ہدایات کا ہلکا سا پرتو بھی اپنی تعلیم پر نظر نہیں آتا۔ آنے والے طالع آزما اور مفاد پرست سیاست دانوں نے تعلیم کے اس نقشۂ راہ کو اٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ آغا خان بورڈ کی اباحیت پسندانہ پالیسی، مخلوط تعلیم کی روز افزوں ترویج، تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کی پامالی اور سیکولر این جی اوز کا تسلّط، ہماری اِسی غفلت اور کوتاہی کا نتیجہ ہیں ؎

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

الفوز اکیڈمی

اسلام آباد

کے زیرِ اہتمام

دین کے جامع تصور ، فکری ، علمی اور عملی تربیت کے لیے

تین اِقامتی کورس

لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ . (التوبۃ : 122)

”مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔“

تعلیم و رہائش مفت

کم سے کم لیاقت انٹرمیڈیٹ ،
گریجویٹ افراد کو ترجیح دی جائے گی

زرِ تعاون کے ساتھ آج ہی اپنا نام رجسٹر کرائیے۔

- ہر لیکچر کے ساتھ کتابچہ یا ہینڈ آؤٹ فراہم کیا جائے گا۔
- منتخب آیات ، احادیث اور مسنون دعاؤں کا حفظ۔
- Fast Track
- امتحانات

فہمِ دین کورس

10 جون تا 26 جون 2006ء

(زرِ تعاون-/3,000 روپے)

قرآنی عربی کورس

10 جولائی تا 30 جولائی 2006ء

(زرِ تعاون -/4,000 روپے)

فہمِ دین کورس

یکم اگست تا 15 اگست 2006ء

(زرِ تعاون-/3,000 روپے)

الفوز اکیڈمی کی تین نئی مطبوعات

1- قیادت اور ہلاکت اقوام

(قیمت-/100 روپے)

2- معارف نبوی ﷺ

(قیمت-/120 روپے)

3- تزکیۂ نفس (قیمت-/140 روپے)

اکیڈمی کی کتابوں کا سیٹ -/1,100 روپے میں

رابطہ

الفوز اکیڈمی ، گلی نمبر 15 ، پولیس فاؤنڈیشن E-11/4 ، گولڑہ ، اسلام آباد

Tel: 051-210-67 83 / 211-26 50 Fax: 051-211-26 51 / 210-63 66

Email:chishti@apollo.net.pk

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس چیز میں فحاشی ہو وہ اُسے عیب دار بنا دیتی ہے اور جس چیز میں حیا ہو وہ اُسے زینت بخشتی ہے۔

(مشکوٰۃ المصابیح)

تصادم نہیں' مفاہمت

جامعہ ازہر میں شہزادہ چارلس کا خطاب

ترجمہ: محمد ایوب منیر ○

اس قدیم و عظیم مرکزِ علم و دانش میں مجھے خطاب کی دعوت دی گئی ہے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو مجھے حاصل ہوا ہے۔ مصر اور جامعہ ازہر میں آمد کے موقع پر میں یہ بھی گزارش کروں گا کہ سرزمینِ مصر میرے لیے خصوصی مقام و مرتبے کی حامل ہے' یسوع مسیح (علیہ السلام) نے اپنا بچپن اس سرزمین پر بسر کیا تھا' اِسی لیے یہ سرزمین بہت سے لوگوں کے لیے قابلِ احترام ہے۔

مجھے اسکالر ہونے کا دعویٰ نہیں' تاہم میں کیمبرج یونی ورسٹی میں شعبۂ تاریخ کا طالب علم رہا ہوں اور مجھے ابراہیمی ورثے سے آگاہی کا بے انتہا شوق رہا ہے۔ میری پیدایش بھی ابراہیم (علیہ السلام) کے پیروکار گروہ میں ہوئی ہے۔ آج میری جو بھی شناخت ہے وہ اسی روایت کا نتیجہ ہے۔ میں آج ابراہیم (علیہ السلام) سے نسبت رکھنے والے مذاہب میں سے ایک مذہب کے پیروکار کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔

ہم ایک خدا پر ایمان رکھنے کی مشترک اساس رکھتے ہیں' وہ خدا جو ابراہیم (علیہ السلام) کا خدا ہے' اور یہ ایمان ہمیں دائمی اقدار عطا کرتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ تبدیلی اور اختلاف سے تباہ حال دنیا کے سامنے اِن اقدار کی بار بار جرأت سے بات کریں۔ میں آپ کے لیے یہی پیغام لے کر آیا

○ لیکچرار، گورنمنٹ اسلامیہ کالج' لاہور کینٹ

ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے سبب ہمارے مشترکہ ورثے میں سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ قدر ایک دوسرے کا احترام اور اُس کی مخلوق کا احترام ہے۔ رب تعالیٰ کی پیدا کردہ تمام مخلوقات اور ماحول (environment) کا احترام درحقیقت اللہ تعالیٰ کے احترام و اکرام کا اظہار ہے اور رب تعالیٰ ہی ساری کائنات میں جلوہ نما ہے۔

اسی سے دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ ہمارے عقائد اور ہماری اقدار امن کا مطالبہ کرتے ہیں' فساد کا نہیں۔ ہمارے درمیان اِس انسانی کمزوری کی موجودگی کا امکان ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے اور ایک دوسرے پر تنقید بھی کی جائے لیکن ایمان رکھنے والی قوموں کی حیثیت سے' ایمان ہم سے باہمی احترام اور مفاہمت سے بڑھ کر اقدامات کا مطالبہ کرتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عظیم تعلیمات ابراہیمی ایمان کی تلقین کرتی ہیں جو دلوں میں جاگزیں رہتا ہے' جو علم و دانش اور تحقیق و تجزیہ سے ماورا ہے۔ معاشرے میں ہمیں جو بھی مقام و مرتبہ دیا گیا ہو' تعلیم و صلاحیت کے لحاظ سے ہم میں جو بھی نواقص یا خوبیاں ہوں' ہم اپنے ایمان و عقیدے کی سچائیوں کو 'دل کی آنکھ' سے تصور میں لاتے ہیں۔ نبی موسیٰ (علیہ السلام) نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ ایمان دل میں قیام پذیر رہتا ہے:

Thou shalt love thy Lord thy God with all thine heart.

تم اپنے پروردگار رب کی پرستش کرو گے پورے دل سے۔

میرا ایمان ہے کہ عظیم مذاہب مقدس کتابوں کے ذریعے دلوں کو مخاطب کرتے ہیں' اور جہاں تک ایمان کا تعلق ہے اُس کو صرف دل ہی محسوس کرسکتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار مذاہب کے درمیان تاریخی روابط کا ذکر کرتے ہوئے میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچیں کہ میرے نزدیک وہ ایک اور یکساں ہیں۔ اُن کے درمیان اختلافات موجود ہیں اور ہمیں اِن اختلافات کو تسلیم کرنا چاہیے۔ لیکن ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہماری ایک مشترکہ اساس (جڑ) ہے۔ میرے خیال میں' ہمیں رب تعالیٰ کے مقصدِ تخلیق کے بارے میں کسی شک و شبہے کا شکار نہیں ہونا چاہیے: وہ یہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے باہم مربوط اور قریب قریب رکھا جائے! تقسیم میں حقیقتاً ایک وحدت ہے۔ قرآن کریم کی

یہ آیت عموماً میرے دل پر شدید اثرات مرتب کرتی ہے:

اے بنی نوعِ انسان! ہم نے تمھیں مرد اور عورت کے واحد جوڑے سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کر سکو (نہ کہ ایک دوسرے سے دشمنی کرنے لگو)۔ (الحجرات ۴۹:۱۳)

اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کے حوالے سے میں نے اپنی معروضات سب سے پہلے ۱۹۹۳ء میں ایک اور عظیم درس گاہ اوکسفرڈ یونی ورسٹی میں ایک تقریر میں پیش کی تھیں۔ میں نے اُس وقت جو بات کہی تھی وہ آج بھی میرے لیے مسئلہ بنی چلی آ رہی ہے۔ میں نے کہا تھا: ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کے میدان میں بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہونے والی ترقی اور بڑے پیمانے پر سفر اور نسلوں کے باہم گھل مل جانے کے باوجود...... اسلام اور مغرب کے درمیان غلط فہمیوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اختلافات مزید بڑھ رہے ہیں۔

افسوس کہ گذشتہ ۱۲ برسوں نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ تمام برس غیر معمولی طور پر حوصلہ شکن رہے ہیں۔ تباہی اور موت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ دیکھ دیکھ کر میرا دل بوجھل ہے اور اس سلسلے کو میں نے خود محسوس کیا ہے۔ میرے پیارے عم محترم لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۹۷۹ء میں دہشت گردوں کے بموں سے جاں بحق ہوئے۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے معاشروں کا تصور بھی خوف ناک ہے۔ بوسنیا سے بغداد تک' چیچنیا سے فلسطین تک یہ ثبوت فراہم ہوئے کہ غلط فہمیاں کس قدر تیزی کے ساتھ بڑھیں اور ان میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ تشدد' جس کے لیے عموماً مذہبی دلیلیں فراہم کی جاتی ہیں' کے نتیجے میں دل خطرناک حد تک سخت ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال سے کس بہتری کی امید کی جا سکتی ہے؟

اُسی تقریر میں' میں نے یورپ اور اسلامی دنیا کی تاریخ کے حوالے سے بات کہا تھا کہ کس طرح وہ رسّی کے بلوں کی طرح باہم مربوط ہیں' اور کئی صدیوں تک دونوں اطراف سے اخذ و عطا کے عمل کے سبب کس طرح وہ صورت حال وجود میں آئی جو ہمارا آج بن کر ہمارے سامنے ہے۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ علم و تحقیق' سائنس' ادب اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں عظیم تخلیقی پیش رفت نے اُٹھان اُس وقت لی تھی جب ابراہیم (علیہ السلام) کے نام لیوا خاندان

نے مل جل کر کام کیا تھا۔ کیا ہم علم و حکمت و تحقیق کے اُس عظیم الشان مظاہرے سے رہنمائی حاصل نہیں کرسکتے جس کا مظاہرہ نویں اور دسویں صدی میں عباسیوں کے دور میں کیا گیا تھا جب اُن کا دارالحکومت قرطبہ علم و حکمت کا دنیا بھر میں سب سے بڑا مرکز تھا' یا دسویں سے چودھویں صدی کے ہسپانیہ سے' جب قرطبہ اور طلیطلہ جیسے شہروں میں مسلمان' عیسائی اور یہودی اسکالروں کا کام نشاتِ ثانیہ کا سبب بنا؟ ہمیں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم اہلِ مغرب پر مسلمان عالموں اور محققین کا یہ احسان ہے کہ جب یورپ تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا' علم کے قدیم خزانوں کو انھوں نے مالا مال کیا۔

میں نے اُسی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ خیالات کی زرخیز نشوونما کے باوجود' افسوس ناک حد تک دونوں طرف ایسے لوگ موجود رہے جن کے ایک دوسرے کی تہذیب کے بارے میں ناقابلِ تفہیم تعصبات ختم نہیں کیے جاسکے۔ باہمی عدمِ اعتماد کا یہ قدیم اور طول طویل سلسلہ ازسرنو بڑھتا جارہا ہے اور اس کے خوف ناک نتائج بھی سامنے آتے چلے جارہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ اُن مسلمانوں پر کیا گزرتی ہوگی جو یورپ میں رہتے ہیں اور جب اُن کے ہم وطن مغربی 'اسلامی خوف' کے بہکاوے میں آکر مسلمانوں کو متفرق اور مسلسل تکلیف دہ ردعمل کا نشانہ بناتے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ کہیں کہیں مسلمان ممالک میں رہنے والے مسیحی سخت حقارت آمیز اور ناروا سلوک' پابندیوں اور اپنے مسلم ہم وطنوں کے ہاتھوں بدتہذیبی کے مظاہر برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ میں دنیا بھر میں دہشت گردی اور تشدد کے ان خوف ناک اور بدترین واقعات کے بارے میں بھی سوچتا ہوں جو مذہب کے مسخ شدہ نام پر روبہ عمل لائے گئے۔

میرا دل کہتا ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان باہمی اعتماد بحال کرنے کے لیے ذمہ دار مرد و خواتین کو ضرور اپنا کردار ادا کرنا ہوگا' اور اُس زہرآلود بداعتمادی پر قابو پانا ہوگا جس نے کئی قوموں کی زندگی کو اجیرن کر دیا ہے۔ یقیناً کیچڑ اُچھالنے والے کچھ ذرائع ابلاغ اور فضولیات و بےمقصدیت پر مبنی طرزِعمل نے اس منزل کا حصول غیرمعمولی طور پر مشکل بنا دیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے عاجزانہ انداز میں' میں نے اپنے اداروں The Prince's Trust نیز Foundation for The Built Environment اور The School of Traditional Arts میں بھرپور کوشش کی

ہے کہ مختلف قوموں اور نسلوں کو اکٹھا کرنے کے ذرائع تلاش کیے جائیں اور برطانیہ کے اندر اسلامی تہذیب کی جو موثر اور مبنی بر خیر نمایندگی ہے اُس کو تسلیم و اجاگر کیا جائے۔ میرے خیال میں دیگر تمام گروہوں کے لیے یہ ایک موثر تجربہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ ان اداروں کا دائرۂ کار دیگر ممالک ہیں۔ چھوٹے چھوٹے منصوبوں اور مثالوں کے ذریعے باہمی اعتماد کی بنیادیں، احترامِ باہم اور دوسروں کے بارے میں فکرمند رہنے اور رواداری کو ازسرِنو رواج دیا جاسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسا ماحول تشکیل دیا جائے جہاں مشترک انسانیت کے احساس کو تقویت ملے، نہ کہ انسان صرف ٹکنالوجی کے کل پرزے بن کر رہ جائیں جو آج کی مشینی دُنیا میں ہمارے اِردگرد ہر طرف پھیلے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

مختلف مذاہب کے درمیان تنازعات اور غلط فہمیوں کی بدولت ہی جنگ اور تشدد کی المناک تاریخ مرتب ہوئی ہے۔ دو غیر مقدس، سیکولر مذاہب، کمیونزم اور فاشزم (فسطائیت) نے بھی تباہی و بربادی اور ظلم و زیادتی کے اَن گنت سنسنی خیز باب رقم کیے ہیں۔

معاشروں کے ارتقا میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس تباہ کن ورثے کے دو واضح ردعمل بار بار سامنے آتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے مذہب کو مزید قوت کے ساتھ تھامے رکھتے ہیں اور اسے وہ اپنی زندگی کے استحکام کا سبب سمجھتے ہیں اور جیسے ہی کوئی خلفشار یا تنازع سر اُٹھاتا ہے، ایسا فرد سمجھتا ہے کہ دیگر مذاہب میرے مذہب کے لیے خطرے کی علامت ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں کہ جو مذہب کے تصور ہی سے لاتعلق ہوجاتے ہیں اور مابعد الطبیعیات کے مکمل فلسفے کے ذریعے ایسی منزل کی تلاش میں مگن ہوجاتے ہیں جو ہماری ایمانی حدود سے کاملاً باہر ہے۔ وہ خدا میں کسی قسم کے یقین کا ہی انکار کردیتے ہیں اور مذہب کو 'دقیانوس'، 'ازمنۂ وسطیٰ' کا اور 'غلط' سمجھنے لگتے ہیں۔ مذہب سے اس دیدہ دلیری سے لاتعلقی اور بےزاری نے مذہب کے لیئے عالمی اقدار اور زندہ روایات کے ورثے کے لیے خطرے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ محض ہمارے روایتی مسیحی کلیسا کی بات نہیں ہے بلکہ مادہ پرستی اور دیگر حقیر مقاصد نے اسے ساری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔

یورپ میں، مختلف مسیحی دھڑوں کے درمیان بظاہر ختم نہ ہونے والی جنگوں کے ایک جزوی ردعمل میں بہت سے مخلص لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم حقیقی لادین (secular) معاشرے تشکیل

دے ڈالیں۔ اس سے تشدد، کٹرپن اور علمی تکبر (جنھیں مذہب کے ساتھ نتھی کیا جاتا تھا) ختم ہوجائیں گے، تنازعات کا خاتمہ ہوجائے گا، جنگوں کو جنم دینے والے اسباب مٹ جائیں گے اور ہم سب کے سب بہترین زندگی گزار سکیں گے۔ اُنھیں اُمید تھی کہ (ریاست) اور اداروں کے مالک مذہب کی نسبت، مادی خوش حالی اور لوگوں کے تحفظ کے لیے سائنسی ایجادات کا استعمال زیادہ بہتر ثابت ہوگا، اور اس طریقے سے یگانگت، ترقی اور انسانی مسرت کی طرف سفر بغیر کسی مزاحمت کے ایک تسلسل سے جاری رہ سکے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ زیادہ آسان ثابت نہ ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنسی علم ہمارے لیے بہت کچھ لے کر آیا ہے اور ہم اسے بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ علم، حکمت و دانش کے برابر نہیں ہے۔ یہ صرف عقل و دانش کا کام ہے کہ عالم گیر اور دائمی حقائق کا انکشاف کرسکے جو کہ تمام مذاہب کی بنیادوں میں مضمر ہیں۔ جن سچائیوں اور اخلاقی اقدار نے ہمارے باپ دادا کی زندگیوں کو ایک محفوظ مقصدِ زندگی کا نقشہ فراہم کیے رکھا، آج ہمارے زمانے کے اکثر لوگوں کی زندگیوں میں یہ سچائیاں اور اخلاقی اقدار بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں یا مکمل طور پر مٹ چکی ہیں۔ یہ معاملہ صرف مغرب کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ ابراہیمی مذاہب کے ہر رنگ و آہن میں اس کی موجودگی نظر آتی ہے۔

اس نقصان کے اطلاقات نہایت گہرے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جدیدیت اُس دانائی سے ملتی ہے جو مذہبی روایت کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔ اس روایت کے لیے احترام میں کمی کا انتہا پسندی نے فائدہ اُٹھایا۔ مذہبی ایقان میں کمی کے باعث بہت سے لوگ اس پر مجبور ہوئے ہیں کہ وہ نئے پیمانوں اور اصولوں میں پناہ ڈھونڈیں۔ پرانے دور کے جامد عقائد کی طرح کسی اشتباہ یا سرسری اختلاف کو برداشت نہ کریں اور انتہا پسندی کی مختلف شکلوں کو قوت فراہم کرتے رہیں۔

ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام نے اپنے دورِ عروج میں جس ذہنی ارتکاز، وسعت امکانات اور علم و حکمت کے لیے جس احترام کو متعارف کرایا تھا، اُس کو ازسرنو زندہ کریں۔ اسلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کو اہلِ کتاب قرار دیا کیونکہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح مقدس کتابوں، یعنی قرآن، عبرانی انجیل اور عہدنامہ جدید پر یقین رکھنے والے مذاہب کا حصہ ہیں۔ اسلام کے عروج

کے اُس اعلیٰ دور میں وہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ مقدس اِلہامی کتابوں کو سمجھنے کے لیے تعبیر و تشریح کے ایک عمیق علم سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ ایک مشکل کام اور پیچیدہ فن ہے۔ تاہم اسلام میں تشریح و تعبیر کے عظیم اصولوں کو رواج ملا اور اس کے بعد فقہی اسکول بھی قائم ہوئے۔

متن اور تشریح کے درمیان تعبیر و توضیح کی ضرورت پیش آتی ہے، یعنی ہر دور میں خدا کا پیغام کیا ہے اور اِس دور میں خدا کا پیغام کیا ہے۔ یہ اسلام کی عظمت ہے کہ اسلام نے اس چیلنج کو پوری گہرائی میں جا کر سمجھا۔ اس عظیم تاریخی درس گاہ میں آج کرنے کا یہی کام ہے۔ آپ نہ صرف اہلِ اسلام کے لیے بلکہ ابراہیم (علیہ السلام) کے دیگر پیروکاروں کے لیے بھی مثال بن سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں یہ رُجحان بہت عام ہے کہ صرف متن کو پڑھا جائے۔ گویا اُس کی تشریح سے آگاہ ہونے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے، یعنی ہم صرف اُس کے سطحی مفہوم سے مکمل فہم حاصل کرسکیں گے۔ اس سے الہامی کلام کو نقصان پہنچتا ہے اور اس نقصان سے فرد کو اور آخرکار ساری دنیا کو نقصان پہنچتا ہے۔

جب مقدس کتابوں سے ہمیں سچی باتیں ملتی ہیں، جب ہم ربِ کائنات کی رنگین کائنات میں سے صرف سفید اور سیاہ کا انتخاب کرلیتے ہیں، تو اُس سے کائنات میں اختلافات کو جنم دینے کا آغاز کردیتے ہیں، یعنی اچھا اور بُرا، نیک اور بد، دوست اور دشمن۔ اس تقسیم سے نفرت اور تشدد جنم لیتا ہے۔ اس طرح ہم ابراہیمی مذہب کے سب سے اہم اصول کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوجاتے ہیں جس نے ابراہیم (علیہ السلام) کی پیروی کرنے والے تینوں مذاہب کو جوڑ رکھا ہے۔ یہ یہودیت میں اس طرح ہے کہ ''اپنے ہمسایے سے بھی اس طرح محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے محبت کرتے ہو''۔ عیسائیت میں یہ اس طرح موجود ہے کہ ''دوسرے انسانوں سے جو کچھ تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے اس طرح سے پیش آئیں، اُسی طرح تم بھی اُن کے ساتھ پیش آؤ''، جب کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ''کوئی شخص اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔

اگر ہم چاہیں کہ ان تعلیمات پر توجہ دی جائے، حکمت و دانش کی بات پر توجہ دی جائے، انتہاپسندی کا خاتمہ ہو، تو یہ جاننا چاہیے کہ اس سلسلے میں خدا تعالیٰ پر ہمارا ایمان، ہماری کیا رہنمائی کرتا

ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ ہم ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہیں، ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں۔ میں تینوں مذاہب کی بات کر رہا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا مادہ پرستی، روحانیت کے زوال اور بے معنی زندگی کے غلبے میں وہ لوگ زیادہ قابلِ احترام نہیں ہیں جو اپنی ذات سے اُوپر اُٹھ کر سوچتے ہیں، جو اپنی ذات اور اپنی انا کے گرد گھومتے نہیں رہتے، جو سائنس ہی کے پرستار نہیں بنے رہتے اور ایسی کائنات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس میں روح، جسم اور دماغ متوازن رہتے ہیں، اور جو کائنات کو اللہ تعالیٰ کا نہایت حسین تحفہ سمجھتے ہیں۔ یقیناً ہمیں اپنے مشترکہ نکات کی بنا پر متحد ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ایک دوسرے سے لڑتے چلے جانے، یا ثانوی چیزوں ہی پر جھگڑتے رہنے کے بجاے ہمیں اس لیے بھی مشترکہ اقدام کی ضرورت ہے کہ ہمارے پورے سیارے (planet) کو ماحولیاتی خلفشار کا چیلنج درپیش ہے۔ کیا اسلام ہماری رہنمائی نہیں کرسکتا کہ ہم اپنے آپ کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کریں؟ کیا ہم فوری اقدام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ مشرق کی الہامی ذہانت اور مغرب کا عملی ذہن مل جل کر کوئی نہ کوئی صورت نکالے، قبل اس کے کہ بہت زیادہ تاخیر ہوجائے۔

ہمارے تینوں مذاہب کی تعلیمات کے اندر ایک بنیادی نکتہ ایک دوسرے کا احترام بھی ہے۔ یہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے سیاسی نعرہ بازی سے بہت آگے کی بات ہے۔ مسلمان، مسیحی اور یہودی فرد کی عظمت اور قدر و قیمت کے مسئلے پر متفق ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی انفرادیت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں منفرد مقام کا حامل ہے۔ جب ہم اپنے آپ سے آگاہی حاصل کریں گے، اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ ہوں گے، تب ہی ہم دوسروں کو سمجھنے کی اہمیت کو جان سکیں گے اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو مقام دے سکیں گے۔

دوسروں کا احترام اور اُس چیز کا احترام جو دوسروں کے نزدیک قابلِ احترام ہے، یعنی اچھے ادب آداب، معزز طور طریقے اور دوسروں کو سننے پر رضامند ہونا ___ حقیقت میں اپنی اقدار اور اپنے معیارات کے لیے احترام حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ حال ہی میں ڈنمارک سے خاکوں کی اشاعت کے ذریعے ایک گھناؤنا کھیل کھیلا گیا جس کے نتیجے میں جو شدید ردعمل سامنے آیا، اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جو دوسروں کے لیے مقدس اور محترم ہے اُس کو نہ سننے

اور اُس پر توجہ نہ دینے کے نتیجے میں کیا کیا خطرات سامنے آسکتے ہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے مہذب و معزز ہونے کی حقیقی علامت اس کا وہ احترام ہے جو وہ اقلیتوں اور اجنبیوں کو دیتا ہے۔ عربوں میں اجنبیوں اور اُن کے علاقوں سے گزرنے والے مسافروں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ حقیقتاً عرب ثقافت کا یہ ایک قابلِ فخر پہلو ہے۔ ہم نے بھی اپنی سرزمین، برطانیہ میں بھرپور کوشش کی ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کا خیر مقدم کیا جائے، اور اُنھیں اس کا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اپنی منفرد شناخت کو بھی محفوظ رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُنھیں برطانوی ثقافت میں رچنے بسنے کا موقع بھی دیا جائے۔ اب برطانوی مسلمانوں کی تعداد ۱۵ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ برطانوی مسلمان کئی حوالوں سے برطانوی معاشرے کو مالا مال کر رہے ہیں، اسی طرح مجھے یقین ہے کہ مسلم ممالک میں مسیحی اقلیتوں کا بھی یہی تعمیری کردار ہے۔

صاحبِ ایمان ہونے کے ناطے، ہم جانتے ہیں کہ انسانی روح کو ابدیت کے اُفق کی طرف بلایا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے وجدان سے احساس ہوتا ہے کہ اب ہم ظاہری دُنیا کی طرف غیر معمولی حد تک راغب ہو گئے ہیں۔ جہاں ہر اُس چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جس کو ناپا یا تولا نہ جاسکے اور جس کا وزن نہ کیا جاسکے۔ لیکن ہم ایمان، حُسن، وفاداری، لُطف و مسرت اور بذاتِ خود محبت کو کس طرح ناپ تول سکتے ہیں، جب کہ یہی چیزیں زندگی کو رہنے کے قابل بناتی اور ہمارے جوہرِ انسانیت کی تعریف متعین کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ کیا یہ خصوصیات ایک داخلی حقیقت کی عکاس نہیں ہیں؟ جب ہم داخلی حقیقت کے بارے میں بات کرتے ہیں، تب حقیقتاً ہم اُس سمت کی بات کر رہے ہوتے ہیں جو مادے سے ماورا ہے، دیگر الفاظ میں، ہم دل کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم دل کے بارے میں استعارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ رحم کا منبع ہے۔ سینٹ پال نے بائیبل کے ایک ترجمے میں اسے خیرخواہی قرار دیا ہے اور عیسائیوں کے نزدیک یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔

ثقافتوں اور مذہب کے درمیان افہام و تفہیم کے مسائل جب درپیش آتے ہیں، اُس کی وجہ صرف اس تصور کی عدم موجودگی نہیں ہے، ایک ایسا تصورِ دل جو مہربان ہو، تبدیلی قبول کرنے والا ہو اور اُس میں قبولیت کی بھرپور صلاحیت ہو۔ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جس میں ہم سب شریک ہو سکتے ہیں اور تینوں مذاہب میں عظیم صوفیا کی تحریروں میں اس کے حوالے موجود ہیں جن میں جولیاں آف

ناروچ، ربی آئزک لوریا اور امام محمد ادریس الشافعی کے نام سرفہرست ہیں۔ کیا ان عظیم مردوں اور عورتوں نے اپنی سدابہار دانش و حکمت کی بدولت ہمیں نہیں بتایا کہ اپنے جارحانہ اور اکثر سطحی طرزِعمل کو نہایت مہربان اور تدبر آمیز رویے سے بدل لیں تاکہ دماغ کے بجائے ہم دل کی اُس سلطنت میں داخل ہوجائیں جہاں ہماری مشترک انسانیت کی خوبی کو ہم پاسکیں؟ میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ یہ غوروفکر کو ترک کرنے کی بات نہیں ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات میں تحرک کے ساتھ شامل ہوجانے کا ایک طریقہ ہے۔ بہرحال ہم الہام اور وحی پر یقین رکھتے ہیں جس نے ہم پر ہمارے مذاہب کی سچائی آشکار کی ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ سائنس نے فطرت کے اندر موجود نظم اور ہم آہنگی کو تلاش کرنے کے سلسلے کا آغاز کردیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جو قدیم لوگوں کو ہزاروں برس قبل دے دی گئی تھی۔ یقیناً اس سے دل کی زندگی کے رب تعالیٰ سے ایک عجب تعلق کی غیر معمولی سچائی کا اظہار ہوتا ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ یہ ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے مذہبی عقائد کے اصولوں کی ترجمانی کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنے مذاہب: اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے اخلاقی وجود کو محفوظ کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ جو عظیم تنوع ہمیں ملا ہے اُس کو تسلیم بھی کریں اور اُس کی تحسین بھی کریں۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے یکساں، یک رنگ اور عالمی کلچر کی بالادستی سے نجات مل سکتی ہے چاہے وہ مذہبی ہو یا غیرمذہبی۔

میرے خیال میں روح کی دنیا کو مادہ پرستی سے محفوظ رکھنے کے لیے، نیز ہم میں سے ہر ایک کے انفرادی احترام کو انتہاپسندی اور تکبر ذات سے بچانے کے لیے ہمیں ایسے طرزِعمل کو اختیار کرنے اور پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جس سے شفقت، نرمی اور ہمدردی کی خدائی خصوصیات بندوں میں پیدا ہوجائیں۔ اس کے لیے پُرسکون رہنے اور احتیاط سے چلنے کی مشق کی ضرورت ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ہمارے مذاہب کے اندر جو حضرات کسی بھی ذمہ داری کے منصب پر فائز ہیں، اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان خدائی صفات کی مسلسل تبلیغ و تلقین کریں۔

تین ہزار سال قبل داؤد (علیہ السلام) کے بیٹے شہنشاہ سلیمان (علیہ السلام) نے کہا تھا: ''جب مستقبل کے بارے میں کوئی خواب نہ ہوگا تو انسان ختم ہوجائیں گے''۔ میں ایک ایسی دنیا کا

خواب دیکھ رہا ہوں جس میں ہمارے اختلافات کو احترام اور مفاہمت کے ساتھ تسلیم کیا جائے' اور جو دوسروں کے لیے مقدس ہو' اُس کو بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ میں ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھ رہا ہوں کہ جہاں عظیم مذہبی روایات کے لیے بدزبانی نہ کی جائے اور مذہبی تعلیمات کو خودغرض' دنیاوی طاقت کی خدمت کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

اس کام کے مشکل ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ہم نے ـــــ ہم سب نے ـــــ اس کام کا مشترکہ طور پر آغاز کرنا ہے۔ اپنے مذہب اور روایات کو جنھیں ہم بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' بچانے کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ ہم سب کو مل جل کر کام کرنا چاہیے تاکہ ایسی دنیا وجود میں آجائے جہاں ایمان کے ثمرات ـــــ افہام و تفہیم' برداشت اور ہمدردی ہمارے بچوں اور آیندہ نسلوں کی حفاظت کریں۔ ہمیں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے اور آج کے دور میں یہ چیلنج اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اپنی مخلصانہ' پُرعزم اور قلبی کوششوں کو امن کے ساتھ رہنے کے گرد مرکوز کردیں۔ (۲۱ مارچ ۲۰۰۶ء)

امریکا: اسرائیل نواز لابی کی گرفت میں

اطہر وقار عظیم

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امریکی خارجہ پالیسی دنیا بھر میں بالعموم اور مشرق وسطیٰ میں بالخصوص ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا رخ متعین کرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں موجود اسرائیل فلسطین تنازعے میں امریکا کی غیر مشروط اور لامحدود اسرائیل نوازی' کئی عشروں سے دنیا بھر میں سنجیدہ اہلِ علم حلقوں میں سوالیہ نشان بنی رہی ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ آخر امریکا اسرائیل کی اتنے بڑے پیمانے پر مالی' عسکری' سفارتی' سیاسی اور اخلاقی مدد کرنے پر اتنا مجبور کیوں ہے؟

اس سلگتے سوال کا نہایت موثر اور پُر مغز جواب دینے کی کوشش دو مغربی دانش ور پروفیسر حضرات جان میر شیمر (John Mearshimer) اور اسٹیفن ایم والٹ (Stephen M. Walt) نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ Israel Lobby & US Foreign Policy میں کی ہے۔ پروفیسر جان میر شیمر شکاگو یونی ورسٹی میں شعبہ تدریس سے منسلک ہیں' جب کہ پروفیسر اسٹیفن ایم والٹ ہارورڈ یونی ورسٹی میں بین الاقوامی امور کے ذیلی ادارے میں پڑھاتے ہیں۔

۸۳ صفحات کی اس رپورٹ کو مختصر کر کے لندن ریویو آف بکس نے اپنی ۲۳ مارچ ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے' جب کہ اصل رپورٹ بھی انٹرنیٹ پر کسی اچھے سرچ انجن (Google/Yahoo) کی مدد سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس رپورٹ کی سب سے اہم خصوصیت اس کے ۲۱۱ حوالہ جات ہیں جو فاضل مصنفین نے اسرائیل نواز سیاست دانوں' دانش وروں اور سیاسی کارکنوں کی تحریروں اور بیانات سے اکٹھے کیے ہیں۔

ان محققین کی نظر میں امریکا کی اسرائیل نوازی کی دو اہم وجوہات ہیں: ۱- امریکا میں یہ تصور عام کردیا گیا ہے کہ امریکا اور اسرائیل کے عالمی تزویراتی مفادات یکساں ہیں ۲- یہ امریکا کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اسرائیل کی مدد کرے۔

امریکا اور اسرائیل کے تزویراتی مفادات مشترک ہونے کے تصور کا نتیجہ اسرائیل کی بھاری مالی امداد کی صورت میں نکلا ہے۔ گرین بک (جس میں سمندر پار بھیجے جانے والے عطیات اور قرضہ جات کا اندراج ہوتا ہے) کے مطابق اب تک اسرائیل ۱۴۰ ارب ڈالر سے زائد کی امداد امریکا سے حاصل کر چکا ہے۔ سفارتی لحاظ سے امریکا کی اسرائیل نوازی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا اقوام متحدہ کی ۳۲ اسرائیل مخالف قراردادوں کو ۱۹۸۲ء سے لے کر اب تک ویٹو (مسترد) کر چکا ہے۔ حالتِ جنگ میں بھی امریکا اسرائیل کی بھرپور امداد کرتا رہا ہے مثلاً ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں میں امریکا کی نکسن انتظامیہ نے دو بار اسرائیل کی امداد کر کے اُسے روسی جارحیت سے بچایا ہے۔ اسی لیے ایک اہم امریکی عہدے دار نے بالکل صحیح کہا ہے: ''ایسا اکثر ہوا ہے کہ جب ہم نے اسرائیلی وکیل کی حیثیت سے کام کیا ہے''۔

رپورٹ میں فاضل پروفیسر محققین کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل نواز لابی کی سب سے موثر تنظیم امریکا اسرائیل عوامی امور کمیٹی (American Israel Public Affairs Committee) (AIPAC) نے امریکا کے مقتدر سیاسی حلقوں کو باور کرادیا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں بڑھتے ہوئے مشترکہ تزویراتی خطرات سے نمٹنے میں باہمی تعاون سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔

اس مبہم تصور کو اسرائیل نواز لابی نے مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعے عقیدے کا درجہ دے کر اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں ۲ء۲ ارب ڈالر کی امداد امریکا سے حاصل کی ہے۔ اسی نے عرب ممالک کو تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے جس کی وجہ سے امریکا کو بھاری معاشی نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے۔

رپورٹ کے مطابق: اسرائیل فلسطینیوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیاں کرنے کے لیے ہمیشہ یہ دلیل دیتا رہا ہے کہ امریکا اور اسرائیل دونوں ممالک میں امن کو مشترکہ دہشت گردوں سے خطرہ ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پروفیسرز کے مطابق اسرائیل کے ساتھ غیرمشروط

تعاون نے امریکی مفادات کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے' مثلاً اسامہ بن لادن مسلم دنیا میں اپنے لیے ہمدردیاں' اسرائیلی افواج کی یروشلم میں موجودگی اور فلسطینیوں کی مظلومانہ کیفیت کو دلیل بنا کر سمیٹتا ہے۔ یہی اسرائیل نوازی ہے جس کی وجہ سے مسلم دنیا میں امریکا کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپریل ۲۰۰۴ء میں ۵۲ سفیروں نے وزیراعظم ٹونی بلیر کو خط لکھ کر واضح کیا کہ اسرائیل فلسطین تنازعے نے عالمِ عرب بلکہ عالمِ اسلام میں امریکا کے خلاف نفرت کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

رپورٹ میں مختلف حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسرائیل امریکا کا قابلِ اعتماد اور وفادار اتحادی نہیں ہے کیونکہ امریکا کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی مسلسل خلاف ورزی کرتا رہا ہے' مثلاً مقبوضہ بستیوں میں انخلا کے حوالے سے اور فلسطینی رہنماؤں کے منصوبہ بند قتل نہ کرنے کے حوالے سے اسرائیل اپنے وعدوں کی پاس داری میں یکسر ناکام رہا ہے۔ مزید یہ کہ اسرائیل نے حساس نوعیت کی دفاعی ٹکنالوجی' امریکا مخالف ملک چین کو دفاعی لحاظ سے مضبوط بنانے کے لیے فراہم کی ہے۔ ان دلائل کی بنیاد پر مصنفین نے اسرائیل کو امریکا کے لیے ایک تزویراتی بوجھ (strategic burden) قرار دیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق اسرائیل نواز حلقے امریکا سے غیر مشروط تعاون کا مطالبہ درج ذیل وجوہات کی بنیاد پر کرتے ہیں: ۱- اسرائیل ایک کمزور ملک ہے اور دشمنوں میں گھرا ہوا ہے ۲- اسرائیل ایک جمہوری ملک ہے اور کسی بھی حکومت کے ساتھ معاملات طے کرنے کے حوالے سے زیادہ مستحکم پوزیشن میں ہے۔ ۳- یہودیوں نے ماضی میں بہت زیادہ مظالم برداشت کیے ہیں اس لیے وہ امتیازی نرم رویے کے مستحق ہیں ۴- اسرائیل کی اپنے مخالفین کے مقابلے میں اخلاقی حیثیت بہت بہتر ہے۔

حالانکہ زمینی حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اسرائیل نواز حلقوں کا یہ دعویٰ کہ اسرائیل ایک کمزور ملک ہے قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں ہی اسرائیلی فوج زیادہ آراستہ اور مؤثر اختیارات کی مالک تھی۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں شام' اُردن اور مصر کے خلاف یہ کامیابیاں ایک مضبوط ملک اور مضبوط فوج پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اسرائیل مشرق وسطیٰ

میں واحد ایٹمی طاقت ہے۔ سیاسی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو اُردن اور مصر سے امن معاہدوں کے بعد اسرائیل کی تزویراتی حیثیت زیادہ مضبوط ہوگئی ہے۔

یہ کہنا کہ اسرائیل ایک معیاری جمہوری ملک ہے بالکل غلط ہے کیونکہ اسرائیل ایک یہودی ریاست ہے جس کی بنیاد نسلیت (خون) پر ہے حالانکہ امریکی جمہوریت اس کے برعکس ہے۔ یہی وجہ ہے اسرائیل میں موجود ۱۳ لاکھ عربوں کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی سی ہے۔ رہی سہی کسر غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے میں ۳۸ لاکھ فلسطینیوں کو سیاسی حقوق سے یکسر محروم کر کے پوری ہوگئی ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ ناقص ہے۔

اسرائیل نواز حلقوں کا یہ کہنا کہ ماضی میں یہودیوں کی مظلومانہ حیثیت اسرائیل کی امداد اور اُس کے وجود کے برحق ہونے کی اخلاقی دلیل فراہم کرتی ہے ایک غیر منطقی بات ہے۔ کیونکہ اگر کل یہودی مظلوم تھے تو آج اسرائیل کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد وہ ظالم بن کر رہ گئے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر یہودیوں کی آبادکاری اور فلسطینیوں کا اُن کے گھروں سے انخلا ظالمانہ طاقت کے استعمال کے ذریعے سے ممکن ہوا ہے، مثلاً حکومت عثمانیہ کے تحت ۱۸۹۳ء میں موجودہ اسرائیلی علاقوں میں ۹۵ فی صد عرب آباد تھے، جب کہ یہودیوں کی تعداد صرف ۱۵ ہزار تھی یعنی ۳۵ فی صد۔ ۱۹۴۷-۴۸ء میں اسرائیل کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ۷۰ ہزار فلسطینیوں کو زبردستی ہجرت پر مجبور کیا گیا تا کہ اکثریت کو اقلیت میں بدلا جاسکے اور پروپیگنڈا یہ کردیا گیا کہ فلسطینی رہنماؤں نے فلسطینیوں کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اسرائیل نواز حلقوں کا آخری دعویٰ کہ اسرائیل کی اخلاقی حیثیت اُس کے مخالفین سے بہتر ہے، ایک شرمناک دعویٰ ہے کیونکہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصے میں اسرائیلی افواج نے ۵ ہزار فلسطینیوں کو قتل کیا۔ ان میں سے اکثر نہتے اور غیر مسلح تھے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیانی عرصے میں سیکڑوں مصری قیدیوں کو اسرائیلی افواج نے قتل کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں ۲ لاکھ ۶۰ ہزار فلسطینیوں کو بے گھر کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں صابرہ اور شتیلا کے مہاجر کیمپوں میں ۷۰۰ معصوم فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ پہلی انتفاضہ تحریک (۱۹۸۷-۱۹۹۱ء) میں اسرائیلی افواج میں انسان کی ہڈیاں توڑنے والے آلات تقسیم کیے گئے۔ سویڈن کی ایک تنظیم 'بچوں کو بچاؤ' (save the children) کے تحقیقاتی جائزے کے مطابق

۲۹ ہزار ۹ سو کے قریب زخمی فلسطینی بچوں کو انتفاضہ تحریک کے پہلے دو سالوں میں ہسپتال لایا گیا۔ ان بچوں میں سے ایک تہائی بچوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ان تمام بچوں کی عمر ۱۰ سال سے بھی کم تھی۔

دوسری انتفاضہ تحریک (۲۰۰۵ء-۲۰۰۰ء) کے ابتدائی دنوں میں ۱۰ لاکھ گولیاں چلائی گئیں۔ اس وقت سے اب تک اسرائیل ہر یہودی کے بدلے ۳ء۴ فلسطینیوں کو قتل کر رہا ہے، جب کہ مقتولین بچوں کی نسبت ایک اسرائیلی بچہ بالمقابل ۵ء۷ فلسطینی بچے ہیں۔ فلسطینیوں کے علاوہ اسرائیل نے غیرملکی پرامن کارکنوں کو بھی قتل کیا ہے، مثلاً مارچ ۲۰۰۳ء میں ایک امریکی خاتون کو اسرائیلی بلڈوزر کے نیچے کچل کر مار ڈالا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وزیراعظم ایہود بارک خود تسلیم کرتا ہے کہ "اگر وہ فلسطینی ہوتے تو ضرور کسی دہشت گرد تنظیم میں شامل ہو جاتے"۔

۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک صہیونی تنظیموں نے بموں کے ذریعے دہشت گردی کروائی ہے تاکہ برطانیہ کو فلسطین کی طرف راغب کرایا جاسکے۔ ہیم لیون برگ (Haim levenberg) کے مطابق یہودی دہشت گردوں نے ۱۹۳۹ء میں بسوں اور پُرہجوم جگہوں پر بم نصب کرنے کی خوفناک روایت کا آغاز کیا۔

محققین نے بحث کو سمیٹتے ہوئے سوال اٹھایا ہے: اگر تزویراتی اور اخلاقی حیثیت سے اسرائیل قابلِ اعتماد اتحادی نہیں ہے بلکہ تزویراتی بوجھ ہے تو پھر آخر کیوں امریکا کی خارجہ پالیسی کا تمام تر بہاؤ اسرائیل کی طرف ہے؟

اس کا جواب اُن کی نظر میں صرف 'اسرائیل نواز لابی' ہے جس کا مرکزی کردار امریکی صہیونی مختلف سیاسی کمیٹیوں اور تنظیموں کے ذریعے ادا کرتے ہیں مثلاً امریکی اسرائیل عوامی امور کمیٹی (AIPAC) اثرپذیری کے حوالے سے امریکا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے، جب کہ ایک اور تنظیم (Conference of Presidents of Major Jewish Organizations) کا تعلق براہِ راست اسرائیل کی توسیع پسندانہ عزائم رکھنے والی لیکوڈ پارٹی (Liquid Party) کے ساتھ ہے۔ اس تنظیم کے ایک رکن کا کہنا ہے: "یہ ہمارے لیے ایک معمول کی بات ہے کہ کسی معاملے کی حکمت عملی طے کرتے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسرائیلی اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں"۔

یہ لابی اسرائیل نواز عیسائیوں کی پوری کھیپ رکھتی ہے۔ ان میں نمایاں نام گیری بائر

(Gary Buer)، جیری فارویل (Jerry Forwell)، والف ریڈ، ڈک آرمیئے (Dick Armey) اور ٹام ڈیلے (Tom Delay) ہیں۔ ان متعصب عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اسرائیل کا دوبارہ معرض وجود میں آنا بائبل کی پیش گوئی کے مطابق ہے اور اسرائیل پر دباؤ ڈالنا، خدا کی رضامندی کے خلاف کام کرنے کے مترادف ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق اسرائیل نواز حلقے اپنے مضبوط روابط واشنگٹن میں کانگریس اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داران کے ساتھ رکھتے ہیں۔ لابی میں موجود متحرک ارکان امریکی کانگریس کے ممبران کے لیے فنڈز اکٹھے کرتے ہیں۔ اُن کے حق میں سیاسی مہمات چلاتے ہیں۔ یوں اُن کی ہمدردیاں ہمیشہ اسرائیل کے مفادات کے حق میں اکٹھی کرلی جاتی ہیں حتیٰ کہ ایوان نمایندگان کے ممبران معلومات کے حصول کے لیے سرکاری لائبریری یا کانگریس ریسرچ سنٹر جانے کے بجاے ایپک (AIPAC) سے رجوع کرتے ہیں۔ یہی ایپک اُن کی تقریریں تیار کر کے اور پالیسیوں کے حوالے سے مشورے دے کر اور ایوان نمایندگان کے انتخابی اخراجات کے انتظامی معاملات سنبھال کر اُن کی ہمدردیاں سمیٹتی ہے۔

اس لیے ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیے جب ایریل شیرون نے امریکی سامعین کے سامنے کہا تھا: ''جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اسرائیل کی مدد کیسے کرسکتے ہیں تو میں اُنھیں یہی کہتا ہوں کہ صرف ایپک کی مدد کیجیے''۔

رپورٹ کے مطابق اسرائیل نواز گروہ عوامی سطح پر بھی میڈیا کے ذریعے مسلسل یہ یقین دہانی حاصل کرتے ہیں کہ امریکی عوام اسرائیل کے بارے میں مثبت راے رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسرائیل نواز لابی کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ اسرائیل کے بارے میں آزادانہ مباحثہ نہ ہوسکے کیونکہ کھلم کھلا اور غیر جانب دارانہ مباحثے کے نتیجے میں امریکا سے یہ منطقی سوال لازماً پوچھا جائے گا کہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر اسرائیل کی غیر مشروط امداد آخر کیوں کر رہا ہے؟ چنانچہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اہم اور مرکزی ذرائع ابلاغ کے اداروں پر اسرائیلی موقف سے ہمدردی رکھنے والے افراد بٹھائے گئے ہیں۔ جیسا کہ مشرق وسطیٰ کے سیاسی معاملات کے ماہر صحافی ایرک الٹرمین (Eric Alterman) کا کہنا ہے: ''ذرائع ابلاغ پر وہ لوگ چھائے ہوئے ہیں جو اسرائیل کے بارے میں تنقید کا سوچ بھی نہیں سکتے''۔

لہٰذا اس میں قطعاً مبالغہ آرائی نہیں کہ شکاگو ٹائمز، واشنگٹن ٹائمز، وال سٹریٹ جنرل اور دیگر میگزینوں مثلاً کمنٹری ، نیو ری پبلک اور ویکلی سٹینڈرڈ ہرلحہ پُرجوش انداز میں اسرائیل کے دفاع کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مشہور رسالے ٹائم کے سابق انتظامی مدیر میکس فرینکلن (Max Franklen) نے اسرائیل نواز رویوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ''مجھے اعتراف ہے کہ میں اسرائیل کے ساتھ جذباتی طور پر منسلک رہا ہوں' میرا اسرائیل کے بارے میں ہمدردانہ رویہ میرے اُن دوستوں کی وجہ سے ہے جو وہاں (اسرائیل میں) ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے جریدے کے قاری عربوں سے زیادہ یہودی ہیں''۔

اس سب کے باوجود اگر کبھی کونے کھدرے سے نرم الفاظ میں اسرائیل مخالف بات آ بھی جاتی ہے تو اس کی سخت مزاحمت کی جاتی ہے مثلاً سی این این کو اسرائیل مخالف رپورٹ دکھانے پر ایک دن میں ۶ ہزار مزاحمتی ای میلز وصول ہوئیں جس میں اس رپورٹ کے نشر کرنے پر متعلقہ ادارے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

رپورٹ کے مطابق اسرائیل نواز لابی کی ہمیشہ سے انتہائی کوشش رہی ہے کہ تعلیمی اداروں کی فضا کو اسرائیل نواز بنایا جائے کیونکہ اسرائیل کی پالیسیوں کے حوالے سے سب سے زیادہ صحت مند تنقید انھی تعلیمی اداروں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ لابی درس گاہوں کے نصاب پر نظر رکھتی ہے اور مسلسل اس امر کا جائزہ لیتی ہے کہ پروفیسر حضرات کیا پڑھاتے ہیں اور کیا لکھتے ہیں۔ اسی سلسلے کو مزید منظم کرنے کے لیے ستمبر ۲۰۰۲ء میں کٹر اسرائیل نواز یہودی دانش ور مثلاً ڈینیل پائپس اور مارٹن کریمر نے کیمپس واچ (campus watch) کے عنوان سے ایک ویب سائٹ بنائی۔ اس کا مقصد اسرائیل کی پالیسیوں پر تنقید کرنے والے پروفیسروں کے نام اور نظریات کا اندراج کرنے کے لیے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ تاکہ اُن دانش وروں و پروفیسروں کو بلیک لسٹ کر دیا جائے۔ یا پھر اُن پروفیسروں کی متعلقہ انتظامیہ پر سیکڑوں مذمتی خطوط اور ای میلز کے ذریعے دباؤ ڈالا جا سکے مثلاً کولمبیا یونی ورسٹی میں پروفیسر ایڈورڈ سعید اور تاریخ دان رشید خالدی کو لابی نے اپنے اس پروپیگنڈا مہم کا نشانہ بنایا۔

رپورٹ میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ اسرائیل نواز حلقوں کا پروپیگنڈا ہتھیاروں میں سے سب

سے زیادہ پرانا اور خطرناک ہتھیار، اپنے مخالفین پر سامیت مخالف یا یہودیت مخالف (antisemitic) ہونے کا الزام لگاتا ہے۔ حالانکہ یہود مخالف ہونا اور اسرائیل کی پالیسیوں پر تنقید کرنا دو مختلف باتیں ہیں لیکن اسرائیلی پالیسیوں پر ہونے والی تنقید کو یہودیت مخالف نفرت پھیلانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اسرائیل پر تنقید کرتے ہی آپ سامیت مخالف ہو جاتے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ اسرائیل نواز لابی کامل اطاعت چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۲ء کے شروع میں جب عرب دنیا میں امریکا کے خلاف نفرت کم کرنے کے لیے اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم پر نرم الفاظ میں امریکی انتظامیہ نے ناپسندیدگی کا اظہار شروع کیا تو اسرائیل نواز لابی نے 'مشترکہ دہشت گردی کے خطرے' کے حق میں پروپیگنڈا مہم شروع کر کے امریکی انتظامیہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اس لیے یہ بات طے ہے کہ اگر بش انتظامیہ امریکا کو اسرائیل سے دُور رکھنے کی کوشش کرتی ہے یا پھر مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اُسے فوراً اسرائیل نواز لابی اور خود کانگریس کے ارکان کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

رپورٹ میں انکشافات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فاضل مصنفین لکھتے ہیں: اسرائیل نواز قوتیں امریکی افواج کو مشرق وسطیٰ کے معاملات میں اپنے مفادات کے مطابق ملوث کرنے میں طویل عرصے سے دل چسپی لیتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملے کی اہم ترین وجہ 'عراقی تیل' کے بجائے اسرائیل نواز لابی کا دباؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگست ۲۰۰۲ء میں ڈک چینی نے عراق کے خلاف جنگ کے حق میں سخت منفی بیانات کی مہم چلائی جو کہ ریکارڈ پر ہے۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں نے عراق میں تباہی پھیلانے والے غیر روایتی ہتھیاروں کی موجودگی کے حوالے سے اپنے مرضی کے موقف کے مطابق مبہم تصورات پر مبنی معلومات پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا۔ آخر میں صدام حسین نے اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کے ساتھ تعاون کرنے کی بھی یقین دہانی کرا دی تھی جس کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جنگ کے خطرات کم ہو گئے ہیں لیکن اسرائیل کے وزیر خارجہ شمعون پیریز نے ستمبر ۲۰۰۲ء میں ان الفاظ کے ذریعے جنگ پر اصرار کیا: ''صدام حسین کے خلاف کارروائی ناگزیر ہو چکی ہے کیونکہ معائنہ کاروں کی قانونی کارروائی مہذب

لوگوں کے لیے ہی مناسب ہوتی ہے، جب کہ غیر مہذب اور بے ایمان لوگ معائنہ کاروں کی کارروائی کو سبوتاژ کر سکتے ہیں۔

۱۹۹۸ء میں اسرائیل نواز قوتوں نے صدر کلنٹن کے نام کھلے خطوط میں صدام حسین کو اقتدار سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ ان خطوط پر دستخط کرنے والے بیش تر افراد آج بھی امریکی انتظامیہ کی پالیسی سازی میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں نمایاں نام ایلیوٹ ابراہم، جان بولٹن، ڈگلس فتھ، ولیم کوئسل، برٹیڈ لیوس، ڈونلڈ رمس فیلڈ، رچرڈ پارلے اور پال وولف وٹز کے ہیں۔ اُس وقت تو یہ گروہ جنگ شروع کرانے میں ناکام رہا لیکن نائن الیون کے سانحے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس گروہ نے ڈک چینی اور بش کو عراق میں اقتدار کی تبدیلی کے لیے جنگ کرنے پر راضی کر لیا۔

اسرائیل نواز لابی نے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر پروپیگنڈا مہم کے ذریعے صدام حسین کی حکومت کو دنیا کی خطرناک دہشت گرد حکومت ثابت کیا اور اپنی خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے عراق میں تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کا افسانہ گڑھا۔ امریکا پر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسرائیل کے فطری اتحادی ہونے کے حوالے سے دباؤ ڈالا گیا حتیٰ کہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ء میں صدر بش کے نام نیوکنزرویٹوز (اسرائیل نواز لابی) نے خط میں یہاں تک لکھا: ''اگر عراق کا نائن الیون کے حملوں سے براہ راست تعلق ثابت نہ بھی ہوتا تو بھی دنیا کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے حکمت عملی کے طور پر دہشت گردی کو فروغ دینے والی قوتوں کا خاتمہ ضروری ہے اور اس بات میں سب سے اہم کام صدام حسین کو عراق میں اقتدار سے الگ کرنا ہے''۔

۲۰۰۳ء کے اوائل میں عراق پر حملے کے جواز کے لیے تفصیلی بریفنگ امریکی انتظامیہ کو دی گئی جس میں عراق کے حوالے سے مفروضوں پر مبنی معلومات کی بنا پر انتہا پسندانہ اقدام کی سفارش کی گئی اور حیرت انگیز طور پر عراق جنگ میں اسرائیل کے انتہائی سرگرم کردار پر پردہ ڈال دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور امریکی صحافی مائیکل کسلے نے ۲۰۰۲ء میں ایک مضمون میں بیان کیا: ''اسرائیل کے عراق جنگ میں سرگرم کردار کے حوالے سے عوامی سطح پر شاذ و نادر ہونے والی مباحث کو ایک مثال سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے جیسے ایک کمرے میں ہاتھی ہو اور ہر کوئی اُسے دیکھ بھی رہا ہو لیکن کوئی یہ نشان دہی کرنے کے لیے تیار نہ ہو کہ یہ ہاتھی ہے''۔

رپورٹ میں یہ بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے کہ سقوطِ بغداد کے بعد اسرائیل نواز لابی نے شام کے خلاف مہم جوئی کے لیے ایندھن اکٹھا کرنا شروع کیا۔ شیرون کے قومی سلامتی کے مشیر ابراہم ہالوے، وولف وٹرز، رچرڈ پارلے، یورین کلپن اور دیگر اسرائیل نواز صحافی مثلاً زیوشیف، یوی کلائیں نے شام میں بشارالاسد کی حکومت کو امریکا کے لیے خطرہ قرار دیتے ہوئے اُسے اقتدار سے ہٹانے کا مطالبہ اپنی تحریروں اور بیانات کے ذریعے کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایپک نے اپنا سیاسی اثرورسوخ استعمال کرتے ہوئے امریکی کانگریس میں شام مخالف قانون پاس کروالیا جس پر ۱۲ستمبر ۲۰۰۳ء کو خود بش نے بھی دستخط کر دیے۔ قانون کا واحد مقصد شام پر دباؤ بڑھانا تھا۔

اسرائیل نواز لابی کا اب نیا ہدف ایران ہے۔ اس لابی نے ایران کے ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی کوششوں سے امریکا کو ڈرا کر اُسے ایران کے خلاف نیا فوجی محاذ کھولنے پر اُکسانا شروع کر دیا ہے۔ اسرائیلی وزیر دفاع بن یامین بن ایلیزر کا یہاں تک کہنا ہے: ''عراق ایک مسئلہ ہے لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ ایران عراق سے زیادہ خطرناک ہے''۔

حالانکہ ایران کے ایٹمی طاقت بننے سے امریکا کو براہِ راست کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اگر واشنگٹن ایٹمی روس، ایٹمی چین حتیٰ کہ ایٹمی جنوبی کوریا کے ساتھ رہ سکتا ہے تو پھر وہ ایٹمی ایران کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے لیکن اسرائیل نواز لابی کا پروپیگنڈا بدستور جاری ہے جس کا منہ بولتا ثبوت AIPAC کی ویب سائٹ ہے جس میں ایران کے ایٹمی پروگرام کے خلاف مبہم معلومات پر مبنی مضامین آئے روز شامل ہوتے رہتے ہیں۔

فاضل محققین پروفیسرز نے اپنی رپورٹ کے اختتام میں امریکا کو خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ''امریکا اسرائیل کے تحفظ کو مضبوط بنانے کی غرض سے، مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی تشکیلِ نو میں ناکام رہتا ہے تو پھر اُسے انقلابی عربوں اور مسلم دنیا کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسرائیل تو اپنی طے شدہ حکمت عملی کے عین مطابق امریکا کے کندھوں کے پیچھے رہنے، موجودگی کو چھپا کر اپنے خلاف منفی اثرات کو کم کرے گا۔ لیکن امریکا کے خلاف مسلم دنیا میں نفرت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے امریکا کے قومی مفاد میں ہے کہ وہ اسرائیل سے فاصلہ رکھے کیونکہ اسرائیل کی قربت امریکا کی قومی سلامتی کو نئے خطرات سے دوچار کر رہی ہے''۔

دوحہ القدس کانفرنس

عبدالغفار عزیز

تہران میں منعقدہ القدس کانفرنس کے اختتام پر جب ایرانی اسپیکر حداد عادل نے دعا کی کہ ''پروردگار ہم سب کو وہ دن جلد دکھا کہ جب ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ معراج اور قبلہ اوّل میں تیرے حضور سجدہ ریز ہوں'' تو میرے ساتھ بیٹھے سراج الحق صاحب آمین کہتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے۔ اس کانفرنس کے تقریباً ایک ماہ بعد ۱۰ مئی کو قطر کے دارالحکومت دوحہ میں علامہ یوسف القرضاوی کی دعوت پر علمائے کرام کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اس کے آغاز میں چند منٹ کی ایک وڈیو دکھائی گئی۔ تین ماہ کی فلسطینی بچی ایمان پھولوں کے درمیان نُمایاں ترین پھول کی صورت سوئی ہوئی تھی لیکن جیسے ہی کیمرہ چہرے سے چھاتی پر آیا تو دکھائی دیا کہ ایک صہیونی گولی اسے چھید چکی ہے اور ایمان اپنی مسکان ہونٹوں پر سجائے ابدی نیند سوگئی ہے۔ ہونٹوں کے کنارے دودھ کے چند قطرے ابھی تازہ تھے' جب کہ نیچے بچھا بستر سرخ خون سے تر ہو چکا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی پوری کانفرنس سسکیوں میں ڈوب گئی۔

فلسطینی عوام کی نصرت کی خاطر بلائے جانے والے اس اجلاس کا فیصلہ' تیاری اور انعقاد صرف دو ہفتے کے اندر ہوا تھا۔ اس میں اُمت مسلمہ کے اہم نمایندگان کے علاوہ فلسطینی قیادت کی بھرپور نمایندگی تھی۔ محترم قاضی حسین احمد پاکستان ہی نہیں تمام غیرعرب مسلم ممالک کی نمایندگی کر رہے تھے۔ افتتاحی تقریب میں میزبان علامہ قرضاوی کی گفتگو کے بعد حماس کے سربراہ خالد مشعل کا خطاب تھا۔ پھر قاضی صاحب کا اور ان کے بعد مختلف فلسطینی قائدین' مسلم رہنماؤں اور فلسطینی نومنتخب وزیراعظم اسماعیل ھنیہ کا اہم ٹیلی فونک خطاب تھا۔

علامہ قرضاوی نے اپنے افتتاحی خطاب میں اس ہنگامی اجلاس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر آنے والا دن ہمارے فلسطینی بھائیوں کے لیے نئی آزمایش کا موجب بن رہا ہے۔ صہیونی اسلحے کی ہلاکت آفرینی کے بعد اب ایک طرف تو ان پر بھوک کا عذاب مسلط کیا جارہا ہے اور دوسری طرف انھیں خانہ جنگی کی آگ میں دھکیلا جارہا ہے۔ گذشتہ دو ہفتوں میں الفتح اور حماس کے مسلح دستوں کے درمیان باقاعدہ جھڑپیں ہوئی ہیں۔ دشمن کے لیے اس سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ ہم نے پوری کوشش کی کہ اس کانفرنس میں الفتح کے ذمہ داران بھی شریک ہوسکیں۔ خالد مشعل نے بھی ان سے رابطہ کیا اور میں نے خود بھی ان میں سے کئی کے ساتھ فون پر بات کی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ہماری دعوت قبول نہیں کی۔

علامہ قرضاوی نے اس امر پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ بدقسمتی سے صدر محمود عباس (ابومازن) اور ان کا ایوانِ صدر فلسطینی حکومت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں۔ ان کی اس بات کی تائید دوسرے روز کے سیشن میں فلسطینی پارلیمنٹ کے منتخب ارکان نے اپنی تقاریر میں کی۔ انھوں نے کئی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ ۱۳فروری ۲۰۰۶ء کو سابق پارلیمنٹ کا الوداعی اجلاس تھا۔ اس میں کوشش کی گئی کہ منتخب وزیراعظم کے وہ اختیارات واپس صدر کو دے دیے جائیں جو اصرار کر کے صدر یاسر عرفات سے چھینے گئے تھے (کیونکہ اس وقت محمود عباس وزیراعظم تھے)۔ نومنتخب پارلیمنٹ نے ۱۸فروری کو حلف اُٹھایا، ان درمیانی پانچ دنوں میں صدر محمود عباس نے پانچ نئے قوانین ہنگامی طور پر جاری کیے، تاکہ وہ پارلیمنٹ میں نہ پیش کرنا پڑیں، حالانکہ ایسا صرف ایمرجنسی کی صورت میں ہی ممکن ہے جب کہ ان قوانین کا مقصد صرف منتخب حکومت کو بے دست و پا کرنا ہی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے اپنی بھاری اکثریت کی بنیاد پر ان قوانین کو منسوخ کر دیا ہے لیکن اس مثال سے دنیا ایوانِ صدر کی 'فطرت' سے آگاہ ہوسکتی ہے۔ حماس کے ان ذمہ داران نے ارکانِ پارلیمنٹ کی تعداد اور تقسیم بھی واضح کی کہ ۱۳۲ کے ایوان میں ۷۴ نشستیں حماس کی ہیں، چار ارکان آزاد جیتے لیکن انھیں حماس کی تائید حاصل تھی۔ اس طرح ہمارے ارکان ۷۸ ہیں۔ الفتح کے ارکان ۴۵ ہیں۔ نو ارکان چار مختلف دھڑوں کے ہیں جو یوں ہیں: پاپولر فرنٹ ۳، جمہوری اتحاد ۲، آزاد فلسطین گروپ ۲ اور تیسری راہ ۲۔ حماس کے ارکان نے بتایا کہ ہماری پوری کوشش ہے کہ

الفتح کے ارکان اسمبلی کو ساتھ لے کر چلیں۔ ہم نے اسمبلی کی مختلف کمیٹیوں کی تشکیل میں الفتح کو اہم ترین کمیٹیوں کی سربراہی دی ہے۔

وزیراعظم اسماعیل هنیہ کے چچازاد بھائی اور منتخب رکن اسمبلی ڈاکٹر مازن هنیہ نے شرکاے اجلاس کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ فلسطینی عوام کو آپ کی طرف سے مالی امداد سے زیادہ اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ فلسطینی عوام اگرچہ بھوکے مر رہے ہیں لیکن پھر بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ حماس کے ترجمان سامی ابوزهری جو زندگی میں پہلی بار غزہ سے باہر نکل سکے بتا رہے تھے کہ خزانہ خالی ہونے کی بات تو روایتی سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں سابقہ حکومت نے انتہائی مقروض چھوڑا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کرپشن کی تفصیلات اتنی ہیں کہ اس کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔ اقربا پروری کا عالم یہ ہے کہ ۱۳۲ ارکان کے ایوان کے لیے سابق ارکان اسمبلی اور وزرا نے اپنے عزیزوں اور واسطہ داروں میں سے ۶۰۰ ملازمین بھرتی کر رکھے ہیں اور ان کے لیے بھاری تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں۔ ہم مختلف ضابطے بنا رہے ہیں جن سے تنخواہیں بھی کچھ کنٹرول ہو جائیں گی، خاص طور پر بڑی تنخواہوں پر ضرور نظرثانی اور کمی ہوگی۔

حماس کے ان ذمہ داران نے ایک اور اہم پہلو یہ بتایا کہ اگرچہ فلسطینی عوام کو دورِحاضر کے شعب ابی طالب میں حصار کا سامنا ہے لیکن وہ اپنے موقف پر ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلسطینی حکومت کو ہر ماہ تنخواہیں دینے کے لیے تقریباً ۱۷ کروڑ ڈالر درکار ہوتے ہیں جو مختلف ممالک کی اعانتوں سے پورے ہوتے تھے۔ اب یہ امداد روک دی گئی ہے۔ سرکاری ملازمین کے چولہے بجھ رہے ہیں۔ وہ بجلی اور گیس کے بجائے تیل کے دیے اور لکڑی جلانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ صہیونی افواج نے مزدوروں کو مزدوری کے لیے نکلنے سے منع کر دیا ہے۔ کسان اپنی سال بھر کی محنت کے بعد اپنی فصلیں منڈی لے جانے سے عاجز ہیں، کیونکہ کرایہ نہیں اور اگر منڈی پہنچ بھی جائیں تو قیمتیں اتنی کم کر دی گئی ہیں کہ فصلوں کے اخراجات تو کجا کرایہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ گویا کہ پوری کی پوری فلسطینی قوم بے روزگار کر دی گئی ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود عوام ہمارے ساتھ کھڑے ہیں۔ مزدور کسان اور سرکاری ملازمین خاص طور پر اساتذہ فلسطینی حکومت کے خلاف یا تنخواہیں مانگنے کے لیے جلوس نکالنے کے بجاے حماس اور اس کی حکومت کے حق میں جلوس

نکال رہے ہیں۔ بوڑھی خواتین اور بچے جلوس نکال رہے ہیں کہ ہمیں عزت کی موت برداشت ہے ذلیل ہوکر اور اپنے حقوق سے دست بردار ہوکر جینا قبول نہیں ہے۔

وزیراعظم اسماعیل ھنیہ کا ٹیلی فونک خطاب بہت ایمان افروز تھا۔ وہ اپنی پُرثبات آواز میں کہہ رہے تھے: ''الحمدللہ! ہم اقتدار کے لالچ سے مکمل طور پر آزاد ہیں۔ ہمارے سامنے درج ذیل پانچ واضح اور بنیادی اہداف ہیں: ۱- فلسطینی عوام کے حقوق اور مسئلہ فلسطین کے اصول و مبادی کی حفاظت۔ ہماری منتخب حکومت غاصب قوتوں کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے گی۔ ہم کبھی اپنے عوام کے حقوق کا سودا نہیں کریں گے۔ ہم یہاں نہ تو کسی مخصوص تحریک کے نمایندہ ہیں نہ کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم قبلۂ اوّل سے صہیونی استعمار کا خاتمہ چاہتے ہیں، یہی ہمارا سب سے بنیادی ہدف رہے گا۔

۲- فلسطینی قوم کی وحدت کی حفاظت، فلسطینی خون کی حفاظت، خونریزی ایسا سرخ نشان ہے جس سے آگے جانے کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی۔ گذشتہ دنوں جب الفتح اور حماس کے کچھ عناصر کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا تو میں فوراً طرفین کے ذمہ داران کے پاس پہنچا اور دونوں کے درمیان معاہدہ طے کروایا کہ کسی فلسطینی ہتھیار کا ہدف کوئی فلسطینی سینہ نہیں بنے گا۔ فلسطینی حکومت باہم خونریزی کو روکنے کے لیے تمام وابستگیوں سے بالاتر ہوکر کارروائی کرے گی۔

۳- یہ بات عملاً ثابت کرنا کہ مسئلہ فلسطین محدود فلسطینی مسئلہ نہیں، یہ پوری اُمت مسلمہ کا مسئلہ ہے۔ یہ لاکھوں فلسطینیوں کا نہیں، ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔

۴- فلسطینی قوم کا یہ حق تسلیم کروانا کہ اسے اپنی حفاظت کا مکمل حق حاصل ہے، اس کی سرزمین پر اور مقدس مقامات پر استعماری قبضے کے خاتمے کی جدوجہد اسی حق دفاع کا حصہ ہے اور ہمیں جہادِ آزادی کے اس حق سے کوئی قوت محروم نہیں کرسکتی۔

۵- ہم نے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تبدیلی اور اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا تھا اور فلسطینی عوام کی اکثریت نے جس کی تائید کی تھی، اس پروگرام پر عمل درآمد، کرپشن اور فساد کا خاتمہ اور ایک خداخوف، باصلاحیت و اہل قیادت کا کامیاب تجربہ پیش کرنا جو صرف اپنے رب کی رضا کو اپنے ہر عمل کی اساس سمجھتی ہے۔

وزیراعظم اسماعیل ھنیہ نے کہا کہ آج ہمیں اپنے عوام کو ماہانہ تنخواہیں دینے سے بھی محروم کیا جا رہا ہے' لیکن تمام فلسطینی ملازمین جانتے ہیں کہ اگر انھیں تنخواہ نہیں ملی تو ان کے وزیراعظم کو بھی نہیں ملی۔ میں نے اعلان کیا ہے کہ فلسطینی وزیراعظم تنخواہ حاصل کرنے والا آخری شخص ہوگا اور جب بھی تنخواہ ملے گی تو میری پہلے ماہ کی تنخواہ ھدیل غبش نامی اس ۱۲ سالہ شہید فلسطینی بچی کے خاندان کو دی جائے گی جسے ۱۱ اپریل کو صہیونی افواج نے بم باری کر کے شہید کر دیا تھا۔ وزیراعظم ھنیہ نے کہا کہ کچھ لوگ ہمیں ڈراتے ہیں کہ ہماری بات نہ مانی تو چار ماہ کے اندر اندر تمھاری حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم انھیں کہتے ہیں کہ ''اقتدار تو دنیا میں اللہ کی ایک امانت اور آخرت میں بڑی جواب دہی ہے''۔ اس کی فکر نہیں لیکن زمینی حقائق تمھیں بھی بتا رہے ہیں کہ ہماری حکومت چار ماہ نہیں اپنی قانونی مدت یعنی چار برس تک ذمہ داریاں ادا کرتی رہے گی۔

وزیراعظم ھنیہ کے خطاب کے بعد ایک فلسطینی تجزیہ نگار عبدالرحمٰن فرحانہ کا ایک تجزیہ دیکھنے کو ملا جس میں انھوں نے مختلف اسرائیلی ذمہ داران اور صہیونی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں مستقبل کے تین امکانات واضح کیے تھے۔

پہلا تو یہ کہ فلسطین میں انتشار و اضطراب میں اضافہ کیا جائے' اور اس مقصد کے لیے حماس کی حکومت کو ناکام بنایا جائے۔ مقامی سطح پر الفتح' علاقائی سطح پر اسرائیل اور پڑوسی عرب ممالک اور عالمی سطح پر مختلف اسلامی ممالک اور بڑی عالمی قوتوں کو حماس کے خلاف مزید متحرک اور مشتعل کیا جائے۔ یہ نقشہ امریکا و اسرائیل کے لیے سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے لیکن اس میں اصل خطرہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حماس کمزور نہیں مزید مضبوط ہوگی اور فلسطینی عوام کی آنکھوں کا تارا بنے گی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انتظار کیا جائے' سیاسی و اقتصادی دباؤ میں مسلسل اضافہ کیا جائے۔ کم از کم چھے ماہ سے ایک سال کے بعد اس صورت حال کے نتائج کی روشنی میں مزید کوئی فیصلہ کیا جائے' جب کہ تیسرا راستہ یہ ہے کہ زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے' فلسطینی حکومت کو مشکلات کے بھنور میں پھنساتے ہوئے اور اس سے بے پروا ہو کر اسرائیلی ریاست اپنے طور پر انفرادی اور مستقل نوعیت کے فیصلے کرے اور جو بھی نتائج ہوں ان کا سامنا کرنے کے لیے عالمی برادری (اصل میں امریکا) کا سہارا حاصل کرے۔ اس ضمن میں صہیونی وزیراعظم ایہود اولمرٹ کا یہ بیان اہم ہے کہ

ہم عنقریب اور یک طرفہ طور پر اپنی ابدی سرحدوں کا اعلان کر دیں گے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق ایسا کرنے سے فلسطینی آبادیوں کو مزید غتربود کا نشانہ بنایا جائے گا اور ان کے گرد کھڑی کی جانے والی فصیل کو مزید وسیع اور بلند کر کے فلسطینیوں کو مزید محصور و مقید کر دیا جائے گا۔

ان تینوں امکانات کے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ فلسطینی عوام اور حماس سے زیادہ مشکل کا سامنا خود اسرائیل کو ہے۔ وہ حماس حکومت کا خاتمہ کرے تو خود بھی مزید پھنستا ہے اور اگر خاتمہ نہ کرے تو بھوک و حصار کا سامنا کرنے کے باوجود حماس کی مقبولیت کو ابدی استحکام حاصل ہوگا۔ یکم مئی کو مشرق وسطیٰ میں چار رکنی عالمی اتحاد کے نمایندے جیمز ولونسون نے کونڈولیزا رائس کے ہمراہ پریس کانفرنس کرتے ہوئے سوال کیا کہ ''کیا ہم سالانہ ایک ارب ڈالر کے اخراجات سے فلسطینیوں کے لیے قائم کیے جانے والے اپنے نظام کو بالآخر خود ہی تباہ و برباد کر دیں گے؟'' اور پھر یہ کہتے ہوئے ولونسون نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔

حماس اور فلسطینی عوام کی اکثریت نے اس صورت حال میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ قربانیوں کے کاروان کو آگے بڑھائیں گے۔ علامہ یوسف قرضاوی کہہ رہے تھے کہ صہیونی حکومت شاید اس عرب مقولے پر عمل کرنا چاہتی ہے کہ جَوِّعْ کَلْبَکَ یَتْبَعْکَ (اپنے کتے کو بھوکا رکھو تمھارے پیچھے پیچھے آئے گا) لیکن اسے جان لینا چاہیے کہ فلسطینی قوم شیروں کی قوم ہے، جسے اگر بھوکا رکھا جائے تو پھر وہ ہر سامنے آنے والے کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔

دوحہ کانفرنس نے اپنے اعلامیے میں اُمت مسلمہ کے اس فیصلے اور فتوے کا اعادہ کیا کہ پوری سرزمین فلسطین وقف سرزمین اور اُمت کی ملکیت ہے، اس کے بالشت بھر علاقے سے دست برداری بھی شرعاً حرام ہے۔ کانفرنس نے یہ عہد بھی کیا کہ اگرچہ فلسطینی قوم نے اپنا شعار یہ چنا ہے کہ الجوع ولا الرکوع، ''بھوکا رہ لیں گے دشمن کے آگے نہیں جھکیں گے''۔ لیکن اُمت کا عہد ہے کہ لا الجوع ولا الرکوع، ''نہ بھوکا چھوڑیں گے اور نہ جھکنے دیں گے''۔ علامہ قرضاوی بتا رہے تھے کہ فلسطین کی مدد کے لیے کی جانے والی اپیل کے نتیجے میں اُمت مسلمہ ایثار و قربانی کی نئی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ مصر اور اُردن میں اخوان کی اپیل پر شروع کی جانے والی امدادی مہم کے دوران چند گھنٹوں میں کروڑوں جمع ہوگئے ہیں۔ مصر میں مالی مدد کے علاوہ ۲۰ کلو سونا بھی جمع ہوا

ہے۔ مجھے ایک صاحب نے ایک پیٹی بھجوائی' کھولی تو اس میں ۵۰ لاکھ ریال (تقریباً سوا آٹھ کروڑ روپے) تھے۔ بھجوانے والے نے اپنا نام نہیں بتایا اور کہا کہ یہ فلسطین بھجوا دیں۔

محترم قاضی صاحب نے بھی اپنے خطاب میں اسی بات پر زور دیا تھا کہ فلسطینی قوم کی سب سے بڑی قوت اس کا حق پر ہونا ہے اور حق پر ثابت قدم رہ کر ہی کوئی قوم فلاح پا سکتی ہے۔ فلسطینی قوم نے اپنے حقوق سے دست بردار نہ ہو کر ثابت کیا ہے کہ اسے غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

قاضی صاحب کی اس بات کی تائید نومنتخب فلسطینی حکومت میں وزیر برائے امور اسیران انجینیر وصفی کبہا کے انٹرویو سے بھی ہوتی ہے جو خود بھی چھے سال سے زائد عرصے تک صہیونی جیلوں میں گرفتار رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان صہیونی جیلوں میں ۹ ہزار ۵ سو فلسطینی قیدی ہیں جن میں سے ۳۵۵ بچے اور ۱۴۰ خواتین ہیں۔ ان میں سے ۱۳ فی صد قیدی ایسے ہیں جنھیں ۵۰ سال سے زیادہ کی سزا سنائی جاچکی ہے لیکن کسی قیدی کے پاے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔

انجینیر وصفی سے پوچھا گیا کہ کوئی ایسا واقعہ جس نے تمھیں بہت متاثر کیا ہو' کہنے لگے: میں وزارت کی ذمہ داری ملنے کے بعد دفتر گیا تو ہماری وزارت میں ملنے والی ایک فلسطینی لڑکی وفا حسن علی نے ملاقات کی اور بتایا کہ میں ۲ اگست ۱۹۸۲ء میں پیدا ہوئی تھی' جب کہ میرے والد صاحب کو ۸ اگست ۱۹۸۲ء کو گرفتار کرلیا گیا تھا یعنی کہ میری پیدایش کے چھے روز بعد۔ آج ۲۴ سال ہونے کو آئے ہیں اور میرے والد صہیونی جیل میں ہیں۔ اسی طرح ایک اور خاتون اُم شادی براستی آئیں اور انھوں نے بتایا کہ میرے بیٹے محمد کو تین بار عمر قید کی سزا ہوچکی ہے۔ دوسرا بیٹا رمزی بھی صہیونی جیل میں ہے اور اسے بھی عمر قید کی سزا سنائی جاچکی ہے' تیسرے بیٹے شادی کو چار سال کی سزا دی گئی ہے اور پانچویں بیٹے سعید کو بھی چار سال کی سزا سنائی گئی ہے' جب کہ چھوٹا بیٹا صابر شہادت کی دہلیز عبور کر کے رب کے حضور پہنچ گیا ہے لیکن یہ ماں خود ہمیں ثابت قدمی کی تلقین کر رہی تھی۔ جب تک ایسی مائیں زندہ ہیں اور تمام قربانیوں کے باوجود اپنے حقوق اور قبلۂ اوّل سے دست بردار ہونے یا اسرائیل نامی کسی ناجائز وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں انھیں کون شکست دے سکتا ہے۔ ایسے قدسی نفوس کی وارث تحریک حماس کو کون شکست دے سکتا ہے!

رسائل و مسائل

وقت اور صلاحیتوں کی تقسیم اور کارِ دعوت

سوال: سعودی عرب میں ہماری ایک دکان ہے۔ میرے والد صاحب جماعت اسلامی کے مخالفوں میں سے ہیں۔ یہاں انھوں نے میرے اوقاتِ کار اتنے سخت رکھے ہیں کہ ۱۸ سے ۲۰ گھنٹے تک مسلسل کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ اس لیے بھی کیا کہ میں تحریک کے لیے الگ سے وقت نہ نکال پاؤں۔ آپ سے درخواست ہے کہ وقت اور صلاحیتوں کی تقسیم کار کے متعلق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مزید یہ کہ ایسے کسب معاش کے ساتھ جو وقت اور صلاحیتوں کے مکمل انہاک کا تقاضا کرتا ہو' اسلام کے جملہ احکامات خصوصاً دعوت و جہاد' خدمتِ خلق' تحریکی' تنظیمی و عائلی ذمہ داریاں بہتر انداز سے کیسے ادا کی جاسکتی ہیں؟

جواب: قرآن و سنت نے انسان کی دنیاوی زندگی کو ایک مہلت' فرصت اور قلیل الوقت قیام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تینوں الفاظ وقت کے صحیح استعمال کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ احادیث میں مزید وضاحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ یوم الحساب ایک بندۂ مومن سے دریافت کیا جائے گا کہ اس نے اپنی جوانی کس کام میں صرف کی' اپنا مال کس کام میں لگایا وغیرہ۔ قرآن کریم زمانے کی قسم کے بعد یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ انسان خسارے میں ہے جو ایمان نہیں لایا' نہ عمل صالح کیا۔ یہاں بھی وقت کو ایک قیمتی اثاثہ' ایک دولت اور ایک نعمت قرار دیا گیا ہے جس کا صحیح استعمال کامیابی اور فلاح و فوز کا باعث بن سکتا ہے اور ضیاع' خسارے اور شرمندگی کا سبب بن سکتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں کے حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ نے جو کتاباً

موقوتا کہا ہے' اس میں وقت کے تعین اور exactness کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز کو اس کے صحیح وقت پر ادا کرنے کے ذریعے پابندیِ وقت اور تنظیمِ وقت (time management) کی عادت ڈالی جائے۔ اس لیے وقت کم ہو یا زیادہ' انسان اس کے لیے مکمل طور پر جواب دہ ہے۔

دوسری بات جس کی آپ نے وضاحت چاہی ہے اس کا تعلق صلاحیت سے ہے۔ قرآن کریم نے اس حوالے سے بہت سے مقامات پر ہمیں متوجہ کیا ہے' مثلاً حضرت یوسفؑ اپنی صلاحیت کے حوالے سے ایک عظیم اور مکمل ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ قرآن کسی فرد کے منصب پر فائز کیے جانے کے لیے اہلیت کو شرط قرار دیتا ہے۔ بعض دینی فرائض کی ادایگی کے لیے استطاعت کا پایا جانا بھی صلاحیت ہی کی تعریف میں آئے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اگر ایک شخص کو تحریر' تقریر' تنظیم یا کسی بھی صلاحیت سے نوازا ہے تو اللہ کے حضور اسے اپنے وقت کے ساتھ اس صلاحیت کے حوالے سے بھی جواب دہی کرنا ہوگی۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر کسی صلاحیت کے پیدا کیا ہے' اس لیے کسی نہ کسی حیثیت سے ہر فرد اللہ کی دی ہوئی صلاحیت کی بنا پر' چاہے وہ فکری ہو یا عملی' جواب دہ ہے۔

اس حوالے سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ صلاحیت کی دریافت اور اس کا نشوو ارتقا اور صحیح استعمال باہم مربوط ہیں۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی حیثیت سے دوسروں سے مختلف صلاحیت نہ دی ہو' حتیٰ کہ ایک باضابطہ طور پر غیر تعلیم یافتہ شخص بھی ایسی بہت سی صلاحیتیں رکھتا ہے جو شاید ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص میں نہ پائی جاتی ہوں۔

صلاحیت کی دریافت اور قرآن و سنت کی ہدایات کی روشنی میں اس کے استعمال کا نام عرفانِ نفس ہے۔ اس حوالے سے ہر مومن مرد اور عورت کو جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کن کن نعمتوں سے نوازا ہے اور کیا وہ ان نعمتوں کو جھٹلا تو نہیں رہا جیسا کہ سورہ رحمٰن میں بار بار ہمیں متوجہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر اگر ادا کیا جاسکتا ہے تو صرف اور صرف حسنِ عمل اور اتقان کا رویہ اختیار کر کے ہی کیا جاسکتا ہے (هل جزاء الاحسان الا الاحسان)۔

کسب معاش کے بارے میں یہ خیال کہ یہ ایک دنیاوی عمل ہے اور دعوت و تبلیغ ایک دینی عمل' مناسب نہیں۔ کسب معاش اگر اسلامی اصولوں پر کیا جارہا ہے تو وہ بھی دعوت کا ایک عملی ذریعہ

بن سکتا ہے اور صلاحیت کے انحطاط کا باعث نہیں بنے گا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب فکر پر تحریک اور دعوتِ حق غالب ہو اور کسب معاش کو دعوت کے لیے استعمال کرنے کی لگن دل میں ہو۔

آپ نے لکھا ہے کہ والد صاحب نے جماعت کی سرگرمیوں سے دُور رکھنے کے لیے آپ کے اوقات کار ایسے رکھے ہیں کہ آپ تحریکی کام کے لیے وقت نہ نکال سکیں۔ اس سلسلے میں ایک تو اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ان کے دل میں دین کی دعوت دینے والوں کے لیے نرمی اور گنجایش پیدا کرے' دوسرے' یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے سے اسی چیز کا حساب لے گا جو اس کے اختیار میں ہو۔ نہ وہ کسی پر اس کی استعداد سے زیادہ بوجھ ڈالتا ہے اور نہ کسی سے اس کی قوت و اختیار سے باہر چیز کے بارے میں جواب طلبی کرتا ہے۔ ہاں' جو وقت بھی آپ کے پاس ہے اس کی جواب دہی لازمی ہے۔ چنانچہ کوشش کیجیے کہ جو وقت آپ کے اپنے تصرف میں ہے اس کا صحیح استعمال ہو سکے۔

دکان پر جو گاہک آتے ہیں ان کے ساتھ آپ کی گفتگو' آپ کا طرزِ عمل' انھیں مناسب اشیا' مناسب قیمت پر دینا اور اشیا فروخت کرتے وقت مناسب انداز میں ایک آدھ کلمۂ خیر کہہ دینا بھی دعوت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کچھ پمفلٹ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو گاہکوں کو مفت دے دیے جائیں۔ بعض اداروں نے محترم سید مودودیؒ اور جماعت کے دیگر صاحبِ فکر افراد کے مضامین' ترجمان القرآن کے اداریے اور بعض مضامین پمفلٹ کی شکل میں جمع کیے ہیں۔ اگر آپ ان میں سے کچھ منتخب پمفلٹ اپنے گاہکوں کو پڑھنے کو دیں تو یہ بھی دعوت کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔

نماز کے اوقات میں مسجد جاتے وقت آپ اس طرح کے پمفلٹ اپنے ساتھ لے جائیں اور لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ اگر گاہک انگریزی خواں ہوں تو انگلش لٹریچر مطالعے کے لیے دیا جا سکتا ہے۔ آپ دکان پر فروخت کے لیے ایسی چیزیں بھی رکھ سکتے ہیں جو خود دکان کی دیگر اشیا کی طرح نفع کے ساتھ فروخت ہو سکیں' مثلاً سی ڈی پر قرآن کریم کا متن و ترجمہ وغیرہ۔ اگر دیگر اشیا فروخت کی جا سکتی ہیں تو لوگوں کی ضروریات کے پیشِ نظر اسلامی اشیا کو بھی فروخت کیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہہ دعوت و جہاد' خدمتِ خلق اور دیگر تحریکی ذمہ داریوں کا پورا کرنا بجاے خود اللہ کا شکر ادا کرنے' اس کا ذکر کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کے واضح ذرائع ہیں' لیکن جیسا پہلے عرض

کیا گیا کہ مالک دکان کی مزاحمت کے باوجود اگر آپ دورانِ کاروبار اپنے ذہن کو استعمال کر کے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ گاہک نہ صرف سامان خریدیں بلکہ آپ کی جانب سے ایک پیغام بھی ساتھ لے کر جائیں تو یہ کاروبار خود دعوت و جہاد کی ایک شکل بن سکتا ہے اور اس کاروبار کے ذریعے بھی آپ خدمت خلق کر سکتے ہیں۔

گھر بھی ایک اہم اور بنیادی تحریکی محاذ ہے۔ قرآن نے اسی لیے کہا ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَھْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)، یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔ اس لیے دنیا بھر کے لوگوں کو دعوتِ حق دینا اور اہلِ خانہ کا حق مار لینا، نہ عدل ہے نہ تحریک کا مدعا۔ تحریکی دعوت کی بنیادوں میں اصلاحِ فرد کے بعد اصلاحِ خاندان اہم جزو ہے اور اسی کی بنیاد پر اصلاحِ معاشرہ اور تبدیلیِ اقتدار کی طرف سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اپنی تمام تر معاشی سرگرمیوں کے باوجود اہلِ خانہ کے لیے وقت ضرور نکالیے، چاہے ان کے ساتھ کھانے کی نشست ہی کیوں نہ ہو۔ اس باہمی ملاقات اور گفتگو کے دوران کوئی نہ کوئی مرحلہ ایسا ضرور آتا ہے کہ باہمی رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں اور دلوں پر پڑے تالے کھل جاتے ہیں۔

اگر وقت، صلاحیتوں، تقسیم کار اور دعوت کے حوالے سے مذکورہ بالا امور کو پیش نظر رکھا جائے، تو حکمت اور توازن و اعتدال کے ساتھ بہتر انداز میں کام کیا جا سکتا ہے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

سالانہ خریداروں سے گزارش

دفتری امور کے بارے میں خط و کتابت کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔

____ مینیجر ترجمان القرآن

کتاب نما

فتاویٰ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی' مترجم: سید زاہد اصغر فلاحی۔ ناشر: دارالنوادر' الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۶۳۶۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی عالم اسلام کی ایک معروف علمی شخصیت ہیں۔ قرآن' حدیث اور فقہ اسلامی پر ان کی گہری نظر ہے۔ دورِ جدید کے حالات' مسائل اور پیچیدگیوں سے وہ بخوبی واقف اور اسلام کی روشنی میں ان کا معقول حل پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ کسی فقہی مکتب فکر کے پابند نہیں بلکہ پورے فقہی ذخیرے سے استفادہ کرتے ہیں جس رائے کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ پاتے ہیں' برملا اسے ترجیح دیتے ہیں۔ اہل سنت کے معروف فقہی استدلال کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں اور انھی کی روشنی میں جہاں ضرورت سمجھتے ہیں' خود بھی اجتہادی رائے قائم کرتے ہیں۔

زیرنظر کتاب موصوف کے ان فتاویٰ پر مشتمل ہے جو انھوں نے قطر ٹی وی پر ایک پروگرام بعنوان: 'ہدی الاسلام' میں سائلین کے جواب میں پیش کیے تھے۔ اس میں عقائد و نظریات' حکومت و سیاست' اقتصاد و معیشت' تمدن و معاشرت' تعلیم و تربیت' طب و سائنس' غرض کہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر اسلام کی روشنی میں رہنمائی فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ زندہ اور روزمرہ درپیش مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں موجود بیش تر فتاویٰ کا تعلق ان موضوعات سے ہے جو عصر حاضر میں دینی و علمی حلقوں میں بالعموم زیربحث رہتے ہیں' مثلاً: اسلام کا سیاسی نظام' اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیوں کا وجود' بنک کا سود' بنک کی نوکری' کرنسی کی خرید و فروخت' اسلام اور جدید سائنسی تحقیقات' رحم مادر کا کرایہ' انسانی اعضا کی پیوندکاری' عورت کا بغیر محرم سفرِ حج' غیرمسلم خاتون سے شادی' عورت اور ملازمت' عورت اور

سیاست، فقہی مسالک میں اتحاد کی ضرورت، فقہی مسائل میں تجدید کی ضرورت، رویت ہلال اور جدید آلات، طیاروں اور مسافروں کا اغوا وغیرہ۔

موصوف نے فتاویٰ میں جوابات کا تفصیلی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اختلافی مسائل میں تمام معروف نقطہ ہائے نظر مع دلائل بیان کرتے ہیں اور آخر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ مصالح عامہ اور رخصت کے فقہی اصول بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ بیش تر مقامات پر شرعی احکام کی حکمت و معنویت دل نشیں پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ اس خوبی کا کریڈٹ کتاب کے فاضل مترجم کو بھی جاتا ہے جنھوں نے مصنف کے استدلال کو بخوبی سمجھا اور شُستہ انداز میں ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ عالم اسلام کی ایک بڑی دینی شخصیت کے رشحات فکر پر مبنی ہے، تاہم اس میں شامل ان کے بعض فتاویٰ سے دلائل کی بنیاد پر یقیناً اختلاف کیا جاسکتا ہے (مثلاً: اباحت موسیقی، عورتوں سے مصافحہ وغیرہ)۔ لیکن اس اختلاف کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اتنی قیمتی کتاب نظرانداز کردی جائے۔ میری رائے میں فقہ اسلامی کے ہر مبتدی و منتہی کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، بالخصوص اصحاب افتا کو اس سے مستغنی نہیں رہنا چاہیے۔ (حافظ مبشر حسین)

زبورِ خیال، ابوالامتیاز ع س مسلم۔ ناشر: القمر انٹرپرائزز، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۱۲۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔

کتاب کی نوعیت کا اندازہ ایک تو سرورق کی توضیح: 'تنقید، مقالات، مباحث' اور دوسرے فہرست عنوانات سے ہوجاتا ہے۔ یہ مجموعہ مصنف کی مختلف النوع تحقیقی و علمی، تنقیدی، علمی و ادبی، واقعاتی و مشاہداتی اور صحافتی و تجزیاتی تحریروں پر مشتمل ہے۔ موضوعاتی تنوع کے باوجود سبھی تحریریں وقیع اور قابلِ قدر ہیں۔

حضرت آدمؑ کے جسدِ مبارک اور حضرت حواؑ کے قد و قامت اور سری لنکا میں قدم گاہِ آدم جیسے موضوعات پر مصنف نے اچھی خاصی تحقیق کی ہے، نتیجہ: حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کئی پشتوں تک نہایت طویل القامت تھی اور کوہِ آدم (Adam's Peak) پر آپ ہی کا نقشِ قدم ہے۔

اسی طرح مرقد حوا کے بارے میں اچھی خاصی تفصیل مہیا کرنے کے بعد بتایا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جدہ پر قبضے کے بعد، مرقدِ حوا کو ملک عبدالعزیز کے حکم سے مسمار کردیا گیا۔ دو تین مضامین ('اسلامی قومیت اور اس کے عملی مضمرات'، 'قیامِ پاکستان کے مخالف علما کا جائزہ' اور 'آشوبِ ملّت' کے زیرعنوان دو تحریریں بھی) اُسی دردمندی اور اضطراب کے آئینہ دار ہیں جو اُمت مسلمہ کی زبوں حالی، پس ماندگی، انتشار، غلامانہ ذہنیت کو دیکھ دیکھ کر مصنف کو پریشان کیے دیتا ہے۔ بعض تحریروں کو بیرونِ ملک قیام کی یادداشتیں اور سفر کے مشاہدات کہہ سکتے ہیں۔ پھر دنیاے شعروادب کا ذکراذکار، ادیبوں اور شاعروں کی بے اعتدالیاں، بعض شعرا کی سوداگرانہ ذہنیت ('بھائی مسلم، ہم یہاں دبئی میں کچھ کمانے کے لیے آئے ہیں'، ص ۱۷۰) یا ایسے پیشہ ور نعت خوانوں کا ذکر جو معاوضے کے لیے ہی نعت خوانی کرتے ہیں (ص ۱۶۳) وغیرہ۔ اس سے ادیبوں اور شاعروں کی کوئی قابلِ رشک تصویر سامنے نہیں آتی۔ دو تحریریں زبان و بیان کے نکات پر اور ایک خالد اسحاق کی یاد میں ____

زبورِ خیال کے مضامین زندگی کے تنوع اور کثیرالجہتی کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن دو باتیں بڑی واضح ہیں، اوّل: ہر تحریر پوری توجہ بلکہ ارتکاز اور انہماک کے ساتھ لکھی گئی ہے، لکھنے والا اپنی سوچ اور اپنے موقف کے بارے میں یکسو ہے، اور اس نے اپنا موقف بڑے عمدہ استدلال اور تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوم: یہ ساری تحریریں ایک ایسے قلب مضطر کے قلم سے نکلی ہیں جو اُمت کی محبت سے لبریز ہے (انتساب کی عبارت: 'ملّتِ مظلومہ محکومہ پاکستانیہ کے نام، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ جس نے یہ نعمت عظمیٰ ہمیں بخشی، اسے سلامتیِ دین کے ساتھ قائم رکھے')۔ ابتدا میں گوانتاناموبے کے اسیر مجاہدوں کے لیے ایک خوب صورت نظم بھی شامل اشاعت ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

تقلید (تجزیاتی مطالعہ) سرفراز حسین صدیقی۔ ناشر: رائل بک کمپنی، BG-5، ریکس سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، جی پی او بکس نمبر ۷۷۳۷، کراچی۔ صفحات: ۳۱۶۔ قیمت: درج نہیں۔

تقلید کے بارے میں تین مختلف قسم کی آرا اور ان پر مبنی رویے اُمت میں پائے جاتے ہیں۔

ایک رویہ ائمہ مذاہب کی اطاعت کو مقصود بالذات قرار دیتا ہے۔ دوسرا' ہر شخص کے براہ راست قرآن وسنت کی پیروی کرنے کا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ جن مسائل میں ائمہ کے اجتہادات قرآن وسنت کے احکام کے خلاف محسوس نہ ہوتے ہوں ان میں تقلید جائز اور عوام کے لیے ضروری ہوگی۔

مصنف نے تیسرے رویے کو دلائل کے ساتھ شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ اہل علم کے نزدیک کوئی بھی امام مستقل مطاع نہیں ہے۔ ہر ایک کے نزدیک دو اطاعتیں مستقل ہیں اور فقہا کی اطاعت کتاب وسنت کی موافقت کے ساتھ مشروط ہے۔ اسی لیے ہر فقہ میں ہر امام' چاہے اس کا تعلق ائمہ اربعہ سے ہو یا اصحاب ظواہر اور اہلِ حدیث سے' ہر ایک اپنے قول کے لیے کتاب وسنت سے دلیل پیش کرتا ہے اور ہر ایک کے نزدیک یہ اختلاف فروعی ہے اور اپنی تحقیق کے راجح ہونے اور دوسرے کی تحقیق کے باطل ہونے کی نہیں بلکہ مرجوح ہونے کا قائل ہے۔

مصنف نے تقلیدِ شخصی میں جن کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے وہ تقلیدِ شخصی کی کمزوریاں نہیں بلکہ عوام کی کم علمی ہے۔ اہلِ علم میں تقلیدِ شخصی کا وہی مقام ہے جو جناب سرفراز حسین صدیقی صاحب اُسے دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ تجویز مناسب ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے محقق' علماے کرام کو مل بیٹھ کر مختلف پیش آمدہ مسائل کے حوالے سے مشترک نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ عوام کے لیے قرآن وسنت پر عمل میں آسانی پیدا ہو اور ایک مسئلے میں مختلف آرا کی وجہ سے وہ پریشانی کا شکار نہ ہوں۔

اسی طرح ان کی یہ راے بجا ہے اور علما میں مسلّم ہے کہ تحقیق کی بنیاد پر کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے دوسرے فقہی مذہب کی طرف انتقال کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ یہ انتقال خواہش نفس کی بنیاد پر نہ ہو۔

یہ ایک دردمند مسلمان کی پکار ہے جو اُمت مسلمہ کو اتحاد و اتفاق اور اجتہاد کے اسلحے سے لیس دیکھنے کا متمنی ہے چونکہ یہی ہمارے عروج کا راستہ ہے۔ دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ پیش کش ہے۔ یہ کتاب دین دار جدید تعلیم یافتہ طبقے کے جذبات و احساسات اور سوچ کی نمایندگی کرتی ہے۔ (خالد محمود)

Promise and Fulfilment : Documented History of All India Muslim League، محمد سلیم احمد۔ پبلشر: شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور۔ صفحات: ۴۳۸۔ قیمت: ۵۵۰ روپے۔

مسلم لیگ کا نام ایک ایسی سیاسی تحریک کے طور پر یاد رکھا جائے گا جس نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو منظم کیا اور اس برعظیم پاک و ہند کے چند علاقوں میں مسلم اکثریتی حکومت کا تصور کیا، جس کے وہ ۶۰۰ برس یکہ و تنہا حکمران رہے تھے۔

مسلم لیگ نے کس طرح آزادیِ وطن کا معرکہ سر کرلیا، اِس کے مختلف جوابات ہوسکتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم احمد، دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور میں صدر شعبۂ تاریخ و مطالعہ پاکستان رہے ہیں۔ اِس کتاب میں تاریخی حوالوں کی مدد سے اُس دور کو کھنگالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب مسلم لیگ قائم ہوئی، مختلف صدور کی قیادت میں اُسے کام کرنے کا موقع کیسے ملا اور طبقۂ خواص کی نمایندہ جماعت کس طرح مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ یہ کتاب مسلم لیگ کے قیام کے ۱۰۰ برس پورے ہونے کے موقع پر شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب کے ۱۲ ابواب ہیں، اس کے پیش لفظ میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمات کا ایک نئے پہلو سے جائزہ ہے، اُن کے خیال میں اس کتاب کا نمایاں وصف اس کے تاریخی حوالے ہیں جو عموماً سرکاری دستاویزات اور مستند کتابوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے تعارف میں پروفیسر موصوف اعلان کرتے ہیں کہ مسلم لیگ مذہبی جماعت نہیں تھی، سیاسی جماعت تھی جس کا نقطۂ نظر عموماً سیکولر رہا۔

مصنف نے بطور تنظیم مسلم لیگ کی خدمات کا جائزہ لیا ہے کہ اس نے کس طرح حقیقی مسائل کی نشان دہی کی اور کس طرح بروقت فیصلے کیے۔ ۱۹۲۰ء میں قائداعظم کی شمولیت کے بعد مسلم لیگ کو نئی زندگی ملی اور قائداعظم نے نظم و ضبط اور قواعد و قانون کی بالادستی پر خصوصی زور دیا۔ محمد علی جناح جیسی شخصیات ہی تاریخ کا رُخ بدلتی ہیں۔ مصنف کا اصرار ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی اپنی قوتِ بازو کی بدولت تھا، وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اصرار کرتے ہیں کہ غیرملکی قوتیں اس میں شریک و دخیل ہیں، کتاب کے اختتام پر تفصیلی نوٹ بھی دیے گئے ہیں۔

پروفیسر موصوف نے تاریخی حوالوں سے ایک اہم تحریر کا جس طرح جائزہ لیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے' اُمید ہے سیاسی تحریکات اور اُن کے اثرات کو سمجھنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ مفاد پرست طبقات کے ہاتھ کس طرح چڑھی اور ہر سیاسی و فوجی حکومت نے اسے اپنی سواری کے طور پر کیسے استعمال کیا۔ اُمید ہے اس پر بھی کام کیا جائے گا۔ محققین' تاریخ کے طلبہ اور سیاسی تحریکات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ غیر معمولی کتاب ثابت ہوگی۔ (محمد ایوب منیر)

پاکستان کی مزدور تحریک ایک نظریاتی مطالعہ، پروفیسر شفیع ملک۔ ناشر: پاکستانی ورکرز ٹریننگ اینڈ ایجوکیشن ٹرسٹ' ایس ٹی ۴/۲' بلاک ۵' گلشن اقبال' کراچی۔ صفحات: ۱۱۷۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

مزدور تحریک کے ساتھ سوشلزم کا تصور وابستہ رہا ہے لیکن پاکستان میں اسلامی نظریہ حیات کے علم برداروں نے اس میدان میں بھی مزدوروں کی رہنمائی کی' اور نیشنل لیبر فیڈریشن کے قیام کے ذریعے اسلامی مزدور تحریک پروان چڑھی۔ پروفیسر شفیع ملک اس سے روزِ اوّل سے وابستہ رہے ہیں اور مزدور تحریک پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اب یہ اس کا نظرثانی شدہ اڈیشن ہے جس میں پاکستان میں مزدور تحریک کی تاریخ' بین الاقوامی پس منظر' سوشلسٹ اور اسلامی مزدور تحریک سب کا اختصار اور جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے اڈیشن کا مقدمہ پروفیسر خورشید احمد نے لکھا تھا جو شاملِ اشاعت ہے۔ (مسلم سجاد)

تعارفِ کتب

☆ **القرآن الکریم**، ناشر: مکتبہ قدوسیہ' رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار لاہور۔ صفحات: ۱۲۹۶۔ ہدیہ: ۴۰۰ روپے۔ [عربی متن کے بعد دوسری سطر میں الفاظ الگ الگ کر کے تیسری سطر میں شاہ رفیع الدینؒ کا لفظی ترجمہ دو رنگوں میں دیا گیا ہے اور چوتھی سطر میں مولانا محمد جونا گڑھیؒ کا بامحاورہ ترجمہ دیا گیا ہے۔ لفظی اور بامحاورہ ترجمے کے تقابلی مطالعے کے لیے مفید' خوب صورت پیش کش۔]

مدیر کے نام

خولہ عبدالفتاح 'کوہاٹ

'تہذیبوں کا تصادم، حقیقت یا واہمہ؟' (مئی ۲۰۰۶ء) وقت کے اہم ترین موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ 'ترجیح آخرت' میں مولانا مودودیؒ کے قلم سے فکرِ آخرت کی تربیت کے لیے فکری و عملی رہنمائی میسر آئی۔ 'قومی ذرائع ابلاغ پر ایک نظر' (مئی ۲۰۰۶ء) میں پیش کیا گیا تجزیہ اور لائحہ عمل عملی اقدامات کی متقاضی ہے۔ حکومت اور ارکان اسمبلی کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیے۔ آغا خان بورڈ پر کچھ عرصہ قبل ایک اچھی تحریر شائع ہوئی تھی۔ بورڈ کی سرگرمیاں جاری ہیں' اس حوالے سے باخبر رکھنے کی ضرورت ہے۔

حمید اللہ خٹک 'لاہور

'قومی ذرائع ابلاغ پر ایک نظر' (مئی ۲۰۰۶ء) عنوان دیکھ کر خیال آیا کہ مقالہ نگار نے نظریاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہوگا۔ لیکن اس میں صرف حکومت اور ذرائع ابلاغ کی کش مکش کی تاریخ بیان کی گئی۔ یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ ذرائع ابلاغ کے ذمہ داران ایک مسلمان ملک کے ذمہ دار شہری ہیں۔ پاکستان کا دستور بھی ان سے کچھ تقاضے کرتا ہے۔ مسلم معاشرہ بھی کچھ توقعات قائم کرتا ہے۔ اس حوالے سے ذرائع ابلاغ کا کیا کردار رہا ہے' یہ جائزے میں آنا چاہیے تھا۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس حوالے سے توجہ دلانا چند فرض شناس شہریوں کا فریضہ ہے جو اخباری مراسلات لکھتے رہیں کہ کیا کیا قابلِ اعتراض لوازمہ دکھایا اور پڑھایا جا رہا ہے' لیکن ذمہ داروں کو جیسے مادر پدر آزادی حاصل ہے کہ دینی اور معاشرتی اقدار کے خلاف جو چاہیں دکھائیں اور چھاپیں۔ کیا ان کے ضمیر نہیں!

احمد علی محمودی' حاصل پور۔ اللہ دتہ جمیل' جھنگ

'تہران کی القدس کانفرنس' (مئی ۲۰۰۶ء) محترم عبدالغفار عزیز کا اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ ایران اپنے مبنی برعدل موقف پر جس جرأت واستقامت سے عالمی قوت کے سامنے ڈٹا ہوا ہے' دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں ایران پر جمی ہوئی ہیں۔ ایسے میں مذکورہ مضمون سے جہاں مفید معلومات سامنے آئیں وہاں براہِ راست ایرانی قوم کے جذبۂ عزم اور حوصلے کی تصویر دیکھنے کو ملی۔ غیرملکی ذرائع ابلاغ پر انحصار اور براہِ راست مشاہدے کا فرق بھی صاف محسوس ہوا۔ کاش! مسلمان اپنی عالمی نیوز ایجنسی تشکیل دے سکیں۔

کانفرنس کی انفرادیت' عالمی اسلامی تحریک کے قائدین بالخصوص فلسطین کی پوری قیادت کی شرکت تھی۔ اُم نضال کی ایمان پرور گفتگو' حماس کی قیادت کو درپیش عملی مشکلات اور ان کے حل کے لیے جدوجہد اور اپنے اصولوں پر کسی قیمت پر سمجھوتہ نہ کرنے کا عزم' اُمت کی طرف سے دل کھول کر مالی امداد کا منظر—— ایک زندہ

اُمت اور مسلمانوں کے فقید المثال جذبۂ اخوت ومحبت کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایرانی قوم کا یہ عزم یقیناً ایک حقیقت ثابت ہوگا کہ ایران پر حملہ پوری اُمت مسلمہ پر حملے کے مترادف ہوگا اور پوری دنیا سے اس کا جواب دیا جائے گا!

اے مراد لعل، چترال

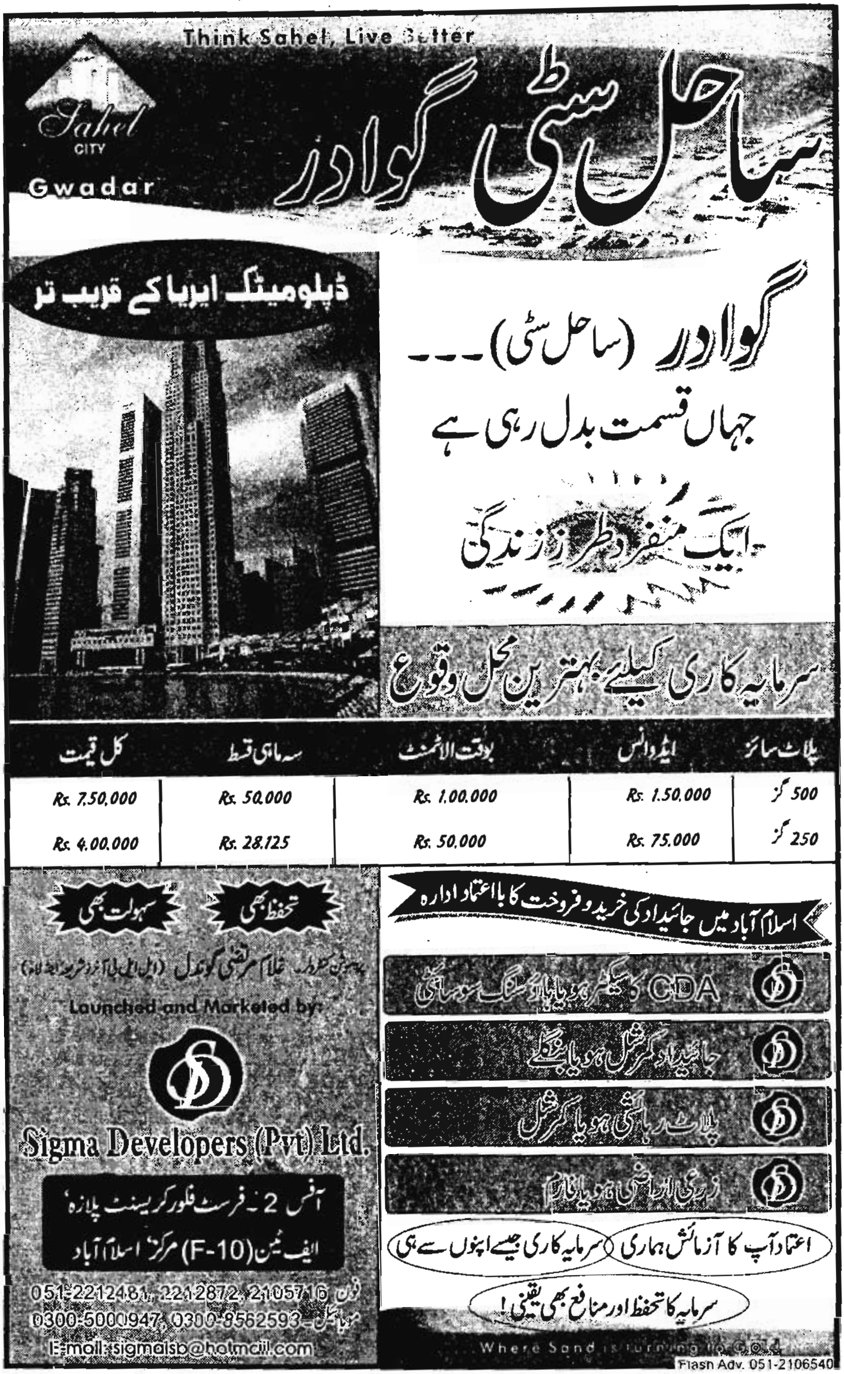
تہران کی القدس کانفرنس (مئی ۲۰۰۶ء) میں سرکاری سطح پر کوئی نمایندگی نہ ہونا افسوس ناک ہے۔ یقیناً اسے عالم اسلام، فلسطینی اتھارٹی اور ایرانی بھائیوں نے محسوس کیا ہوگا، اور ان ممالک میں پاکستان کے اس اقدام سے عام طور پر مایوسی ہوئی ہوگی۔ آخر یہ لوگ کب اپنا قبلہ درست کریں گے!

غلام مصطفی، قصور۔ خالد فاروق، سوات۔ بشیر انور، رحیم یار خان۔ عبدالطیف، کرک

ترجمان القرآن کی توسیع اشاعت کا تقاضا ہے کہ اس میں عام فہم اور مختصر مضامین شائع ہوں، زبان سہل ہو، اور اگر مشکل الفاظ استعمال کیے جائیں تو مفہوم بریکٹ میں دیا جائے۔ مولانا مودودیؒ کے دورِ ادارت میں اس کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ انھوں نے جو لٹریچر بھی پیش کیا اس کے بڑے پیمانے پر عام ہونے کی بنیادی وجہ بھی عام فہم اور سادہ زبان ہے۔ ادارے کی جانب سے ترجمان کی توسیع اشاعت کی اپیل بھی کی جاتی ہے لیکن یہ مسائل اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مئی کے شمارے میں 'تہذیبوں کا تصادم ___ حقیقت یا واہمہ' ایک فلسفیانہ اور پیچیدہ موضوع ہے، جب کہ اپریل میں 'التوحید: عالمی تناظر میں' خشک، مشکل تراکیب اور عبارت پر مبنی تحریر ہے جس کو سمجھنے میں خاصی دقت پیش آتی ہے۔ براہ کرم اس پہلو پر خصوصی توجہ دیں۔

منظور احمد، چکوال

وفاقی حکومت جو نئی تعلیمی پالیسی جون ۲۰۰۶ء میں لارہی ہے اس کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ ۴۶ اختیاری مضامین کی تعداد گھٹا کر صرف ۲۷ مضامین قابلِ مطالعہ قرار دیے جارہے ہیں۔ ۱۹ مضامین جنھیں زمرۂ تدریس سے نکالا جارہا ہے، اُن میں سے ایک فارسی ہے۔ اسے نصابِ تدریس سے خارج کرنا کسی طرح قرین مصلحت وانصاف نہیں کیوں کہ: (ا) فارسی اُردو کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ فارسی زبان کے ۶۰ سے ۷۰ فی صد تک الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں۔ فارسی جانے سیکھے بغیر اُردو کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ (ب) علامہ اقبال کی شاعری کا بیش تر حصہ فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ فارسی سے نابلد رہ کر فکرِ اقبال کی حقیقی روح سے آگاہی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ (ج) برعظیم پاک وہند کے اسلامی عہد کا تمام علمی، تہذیبی وتاریخی ورثہ فارسی میں محفوظ ہے اور اس دور سے متعلق ہزاروں مخطوطات پاکستان، ہندستان اور یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ حیرت ہے کہ اسرائیل میں عبرانی زبان کو جو صدیوں سے مُردہ ہو چکی تھی، دوبارہ زندہ اور رائج کیا جارہا ہے، جب کہ ہمارے ہاں نظام تعلیم میں نت نئے تجربات کرنے والے اربابِ اختیار کا ہمارے علمی وادبی، ثقافتی ورثے اور قومی زبان کی جڑ کاٹنے کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔



Think Sahel, Live Better
Sahel CITY Gwadar
ساحل سٹی گوادر
ڈپلومیٹک ایریا کے قریب تر
گوادر (ساحل سٹی)۔۔۔
جہاں قسمت بدل رہی ہے
ایک منفرد طرزِ زندگی
سرمایہ کاری کیلئے بہترین محل وقوع
پلاٹ سائز | ایڈوانس | بوقت الاٹمنٹ | سہ ماہی قسط | کل قیمت
500 گز | Rs. 1.50.000 | Rs. 1.00.000 | Rs. 50.000 | Rs. 7.50.000
250 گز | Rs. 75.000 | Rs. 50.000 | Rs. 28.125 | Rs. 4.00.000
تحفظ بھی
سہولت بھی
غلام مرتضیٰ گوندل
Launched and Marketed by:
Sigma Developers (Pvt) Ltd.
آفس 2۔ فرسٹ فلور کریسنٹ پلازہ،
ایف ٹین (F-10) مرکز، اسلام آباد
فون 051-2212481, 2212872, 2105716
موبائل 0300-5000947, 0300-8562593
E-mail: sigmaisb@hotmail.com
اسلام آباد میں جائیداد کی خرید و فروخت کا با اعتماد ادارہ
CDA کا سیکٹر ہو یا ہاؤسنگ سوسائٹی
جائیداد کمرشل ہو یا بنگلے
پلاٹ رہائشی ہو یا کمرشل
زرعی اراضی ہو یا فارم
اعتماد آپ کا آزمائش ہماری
سرمایہ کاری جیسے اپنوں سے ہی
سرمایہ کا تحفظ اور منافع بھی یقینی!
Where Sand is turning to Gold
Flash Adv. 051-2106540


SINCE 1979
سنڈپ
قدرتاً بہتر
SUNDiP
Halal
TOMATO
Ketchup
550g
Net Weight
SUNDiP
MIXED
Pickle in O
SUNDiP
SUNDiP
Apple Jam
نورس
NATIONAL DRINK
کیچپ، اچار، جام،
نورس اور بہت ...
ابھی ڈائل کیجئے
Naurus (Pvt.) Limited
C-1/B, S.I.T.E., Karachi- 75700 - PAKISTAN
SUNDiP
Surprise Line: 0900-111-60


QURTABA CREEK VALLEY GWADAR
قرطبہ کریک ویلی
کے نام سے
عظیم الشان
رہائشی و کمرشل
منصوبے کا اعلان
الحمدللہ
تیزی سے بکنگ کے بعد محدود پلاٹ
باقی رہ گئے ہیں
فوری رابطہ آپ کے مفاد میں ہے
ہم فائلوں کا کاروبار نہیں کرتے
لوکیشن :
ساحل سمندر سے ملحق ایک طرف جیوانی ائیر پورٹ اور دوسری طرف مشہور حسین و جمیل پکنک پوائنٹ
کے قریب جہاں ایران اور بلوچستان سے لوگ چھٹیاں منانے آتے ہیں۔
سائٹ سے دو پہاڑوں کے درمیان بہتے ہوئے سمندر کے پر لطف نظارے۔
عالمی شہرت کے حامل Turtle Nesting پوائنٹ سے متصل۔
قیمت
محدود مدت کیلئے
45 ہزار روپے
فی مرلہ
چیک / ڈرافٹ بنام
قرطبہ کریک ویلی
فیصل بنک اقبال ٹاؤن برانچ،
اکاؤنٹ نمبر 142-2011115-001
کو ارسال کیجئے۔
5 ہزار روپے
فی مرلہ بھیج کر فوری
بکنگ کروالیں
30 جون 2006 تک بکنگ کروانے والے احباب کو
-/100,000 روپے فی کنال کی خصوصی رعایت
تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ
احباب ڈویلپرز
مارکیٹنگ آفس: ویل ہاؤس، فیصل روڈ، اولڈ مسلم ٹاؤن، لاہور۔ فون: 5846831, 5857786, 042-5846830 راحیل احمد 0300-4007661 -0300-8422787
فیکس: 5847708 42 92+ ای میل: info@qurtabacreekvalley.com ویب سائٹ: www.qurtabacreekvalley.com
سعودیہ میں رابطہ کیلئے: راحیل احمد 00966-562059096

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

We Make Children Happy



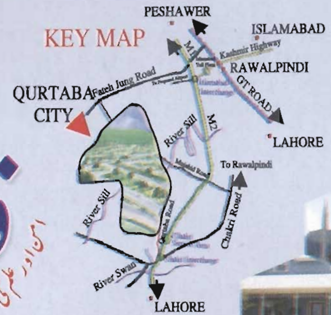
- ***BUBBLES***
- ***SWEETS***
- ***TOFFEES***
- ***SNACKS***

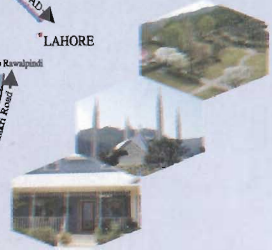
Head Office:
86-A, S.I.E # 1,Gujranwala
Tel: 055-3257794, 4284793
Fax: 055-4257795
E-mail: jojogfi@yahoo.com
Web Address: www.gfi-jojo.com
Factory Office:
53-54 A, S.I.E. # 2. Gujranwala.
Tel: 055-4259374
Fax:055-4283421

Madina Tul Ilm

قرطبہ سٹی

امن اور علم کی بستی اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم و تحقیق





مدینۃ العلم نے ملکی اور بین الاقوامی، مذہبی اور تہذیبی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے ایک مثالی اسلامی شہر، جو کہ اکیسویں صدی کے لیے تعلیم و تحقیق کا محور ہوگا، بنانے اور آباد کرنے کا عظیم منصوبہ قرطبہ ترتیب دیا ہے۔

مدینۃ العلم کا مقصد اور تعارف

مدینۃ العلم نے محسوس کیا کہ تیز رفتار ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی انسانی معاشروں اور مذاہب کے درمیان جو وسیع خلاء پیدا کر رہی ہے اسلام کا فراہم کردہ معاشرتی ماڈل اس کو پُر کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مدینۃ العلم نے یہ بیڑا اُٹھانے کا فیصلہ کیا کہ ایک ایسا رہائشی منصوبہ تعمیر کیا جائے جو اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا محور ہو اور اسلامی معاشرے کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ اس منصوبے کا نام "قرطبہ سٹی" تجویز کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تشکیل دیا گیا بورڈ آف ڈائریکٹرز ملک کے معروف کاروباری افراد جو کہ بین الاقوامی سطح پر معاشرے میں اہم مقام رکھتے ہیں اور مدینۃ العلم کے مقاصد کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہیں، پر مشتمل ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا راز اس کا ہر لحاظ سے خود مختار ہونے میں ہے تاکہ معاشرے کے تمام پہلو مدینۃ العلم کے ماڈل کے مطابق پروان چڑھیں اور اس کی خود مختاری کی کنجی اس منصوبے کا حجم ہے۔ منصوبے کی وسعت اس کے معاشی اور معاشرتی پہلوؤں میں اس کی خود مختاری کی ضمانت ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وسیع اراضی کی خرید جاری ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کی عملی تصویر فراہم کرنے کے لیے ایک رہائشی منصوبے کا قیام دُنیائے اسلام اور ملک کا منفرد منصوبہ ہونے کے ساتھ ایک بڑا چیلنج بھی ہے۔

محلِ وقوع:

اسلام آباد جس کا شمار دُنیا کے چند خوبصورت اور صاف ستھرے شہروں میں ہوتا ہے کی فضاؤں کو مجوزہ شہر قرطبہ کے لیے منتخب کرتے ہوئے اسلام آباد سے تقریباً 50 کلومیٹر کے فاصلہ پر پاکستان موٹروے، چکری انٹرچینج سے ملحقہ خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں، کھلے اور پُر فضا ماحول میں وسیع و عریض اراضی خریدتے ہوئے عظیم منصوبے قرطبہ کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔

مجوزہ سہولیات:

انشاءاللہ قرطبہ اُن تمام جدید رہائشی سہولیات سے مزین ہوگا جو تکنیکی ماہرین اب تک مہیا کر سکے ہیں۔ مثلاً

▲ آبادکاری کی صد سالہ منصوبہ بندی ▲ مین اسکیلر شاہراہ، کشادہ سڑکیں، فٹ پاتھ ▲ بارش پانی کے نکاس کا انتظام ▲ پینے کے میٹھے پانی کی فراہمی کا نظام ▲ گندے پانی کو ٹھکانے لگانے کا انتظام ▲ بجلی کی فراہمی کا زمین دوز نظام ▲ ٹیلی فون کا نظام ▲ قدرتی گیس کی فراہمی کا نظام ▲ خریداری مراکز کی عمارات ▲ معاشرتی مقاصد کے لیے سوک سنٹر، خواتین و حضرات کے لیے سکول کالجز اور پرائمری سکول، ہسپتال، سیکٹر مساجد کی عمارات ▲ پولیس اسٹیشن، پوسٹ آفس، فائر بریگیڈ کی عمارات ▲ قرطبہ کے اندر بس سٹاپ اور دوسرے شہروں کو آنے جانے والے راستوں پر بس اسٹاپ ▲ پیٹرول پمپ ▲ شجرکاری اور پارک بنانے اور دیکھ بھال کا انتظام ▲ حفاظتی دیوار اور سیکیورٹی کا انتظام ▲ کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کا انتظام ▲ سٹریٹ لائیٹ کا انتظام ▲ مدینۃ العلم کے دفتر اور سہولیات کو چلانے اور دیکھ بھال کا دفتر اور ورکشاپ کی عمارات

رہائشی سہولیات کی دیکھ بھال کا نظام:

قرطبہ میں فراہم کردہ تمام سہولیات کا انتظام و انصرام مدینۃ العلم کرے گی۔ جس کے لیے خصوصی ضابطہ تشکیل دیا جائے گا اور تمام رہائشی اُس کے پابند ہوں گے۔

خصوصی سہولیات:

▲ قرطبہ کے لیے اندرونی ٹرانسپورٹ کا نظام ▲ قرطبہ سے راولپنڈی چکری انٹرچینج اسلام آباد تک ٹرانسپورٹ کا نظام ▲ گھروں کی تعمیر کے لیے آرکیٹیکٹ کی خدمات اور ہر پلاٹ سائز کے لیے 50 نمونہ کے ڈیزائن کی فراہمی ▲ بلوں کی ادائیگی اور شکایات کے ازالے کے لیے ون ونڈو آپریشن ▲ قرطبہ کو تعمیر اور آبادی کے مرحلہ کے بعد بھی خوبصورت رکھنے کے لیے خصوصی تعمیراتی قوانین

امتیازی خصوصیات:

▲ بین الاقوامی یونیورسٹی: بین الاقوامی یونیورسٹی اور تعلیمی مرکز کا قیام و انصرام
▲ جامع مسجد قرطبہ: وسیع و عریض میدان سے ملحقہ جامع مسجد اور دینی و تہذیبی تحقیقی مرکز کا قیام و انصرام
▲ تمام یونیورسٹی اور دینی مرکز سے کیبل کے ذریعہ منسلک
▲ خواتین کے لیے خصوصی تجارتی مراکز کا قیام

زوننگ پلان و ٹاؤن پلاننگ اور میونسپل انتظامیہ سے منظوری:

منصوبے کے بنیادی خاکے کے مطابق ملک کے مشہور اور مایہ ناز انجینئرنگ کنسلٹنٹس نیسپاک (M/s NESPAK) نے ایک جامع زوننگ پلان تیار کر لیا ہے۔ فیز 1 کی زمین کی خریداری مکمل ہوتے ہی اس فیز کی ٹاؤن پلاننگ کر دی گئی ہے۔ اور یہ ٹاؤن پلاننگ متعلقہ ایجنسی کے پاس منظوری کے لئے جمع کروا دی گئی ہے۔

پلاٹ بکنگ:

ٹاؤن پلاننگ کی منظوری کے ساتھ ہی مزید پلاٹ بکنگ کے لئے پیش کر دیئے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی الاٹمنٹ کا طریقہ کار اور نئی قیمتوں کا تعین بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ پلاٹ ہولڈرز متوجہ ہوں:

▲ قرطبہ سٹی کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا ڈاک کا پتہ درست کروائیں تاکہ ڈاک کی ترسیل یقینی بنائی جا سکے۔ ایڈریس تبدیل کرنے کے لئے فارم دفتر سے حاصل کریں۔ ▲ اقساط پر بکنگ کروانے والے حضرات فوری طور پر اپنے بقیہ جات اقساط کے جدول کے مطابق ادا کر دیں۔ ▲ بقیہ جات جاننے کے لئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

خواتین و حضرات اپنی رائے اور تجاویز سے مدینۃ العلم کے پتہ پر یا email کے ذریعہ آگاہ کریں۔

مدینة العلم

فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ فضل حق روڈ بلیو ایریا اسلام آباد فون: 92-51-2206380 فیکس: 92-51-2270411
Email: Info@qurtabacity.com

Rev. 3.0

L.R.L 99 *Monthly* TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE. Ph: 7587916 Fax: 7585590